ارمغان تحقیق

(علمی و تحقیقی مضامین)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی

پبلیکیشن ڈویژن

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ارمغانِ تحقیق

(علمی و تحقیقی مضامین)

وارثہ
فاؤنڈیشن انٹرنیشنل
WARSA FOUNDATION
INTERNATIONAL

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی

وَرثہ
فاؤنڈیشن انٹرنیشنل
WARSA FOUNDATION
INTERNATIONAL

ارمغانِ تحقیق

(علمی و تحقیقی مضامین)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی

WARSA FOUNDATION INTERNATIONAL

پبلیکیشن ڈویژن
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

All rights reserved. No part of this publication may be reproduced, stored in a retrieval system or transmitted in any form or by any means, electronic, mechanical, photocopying, recording or otherwise, without the prior permission of the publisher.

© Copyright
Publications Division
Aligarh Muslim University, Aligarh

ISBN : 978-93-91456-85-6

نام کتاب	:	ارمغان تحقیق
مصنف	:	پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی
اشاعت	:	۲۰۲۳ء
قیمت	:	۴۵۰ روپئے
تعداد	:	۲۰۰
صفحات	:	۲۰۴
پبلشر و پرنٹر	:	پبلیکیشن ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Armughan e Tehqeeq

(Ilmi wa Tehqiqi Mazameen)

By : Prof. Ziaur Rahman Siddiqui
Department of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh
Mob. 7018979058, WhatsApp : 9418197673

Edition : I Price : 450/-

فہرست

۱۔	پیش لفظ	۷
☆	لوک گیتوں کی حکائی روایت	۱۱
۲۔	خواجہ الطاف حسین حالؔی اور تعلیم نسواں	۲۱
۳۔	حسرت کی متصوفانہ شاعری میں کرشن کا تصور	۲۹
۴۔	شاعر ہند فراقؔ گورکھپوری	۳۵
۵۔	نریشؔ کی شاعری روایت سے جدّت تک	۴۱
۶۔	متین طارق باغپتی کا تخلیقی کرب	۴۷
۷۔	اردو میں خاکہ نگاری: ایک تاریخی جائزہ	۵۳
۸۔	تحریک آزادی کا مطالعہ: اردو نثر کی روشنی میں	۶۰
۹۔	جلیانوالہ باغ پر اردو اداریے	۶۹
۱۰۔	گاندھی جی ایک مصلح تعلیم	۷۴
۱۱۔	خواجہ غلام السیدین ایک بے مثال ماہر تعلیم	۷۸
۱۲۔	تحریک آزادی اور اردو افسانہ	۸۲
۱۳۔	آخری سواریاں ایک تنقیدی جائزہ	۱۰۲
۱۴۔	سرسید کا خط گراہم کے نام تحقیق کے تناظر میں	۱۰۹

WARSA FOUNDATION INTERNATIONAL

۱۵۔	ہندوستان کی تحریک آزادی اور پریم چند ایک تجزیہ	۱۲۳
۱۶۔	تزک بابری ایک تاریخی تجزیہ	۱۳۳
۱۷۔	دنیا کا سب سے بڑا الفی قرآن مجید	۱۴۵
۱۸۔	اقبال سہیل کی مرثیہ نگاری	۱۵۰
۱۹۔	نظیرؔ کے کلام میں مقامی رنگ فکر و فلسفہ کے حوالے سے	۱۵۷
۲۰۔	ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں میں اردو کا فاصلاتی نظامِ تعلیم	۱۷۳
۲۱۔	فیضؔ کے خطوط	۱۸۵
۲۲۔	کلام شاہ مبارک آبروؔ	۱۹۸

فاؤنڈیشن انٹرنیشنل
WARSA FOUNDATION
INTERNATIONAL

پیش لفظ

'ارمغان تحقیق' میں شامل مضامین علمی و تحقیقی نوعیت کے ہیں جنہیں ذاتی دلچسپی اور علمی ترجیحات کی اساس پر ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔ معدودے چند مضامین موضوع کی مناسبت سے اہم اور تحقیق طلب ہیں۔ اس نوع کے مضامین میں دُنیا کا سب سے بڑا الفی'' قرآن مجید'' سرسید کا خط گراہم کے نام، جلیانوالہ باغ پر اردو ادار یے، گاندھی جی ایک تعلیمی مصلح، حسرت کی متصوفانہ شاعری میں کرشن کا تصور، تزک بابری ایک تجزیہ، غلام السیدین بحیثیت ماہر تعلیم، ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں میں اردو کا فاصلاتی نظام تعلیم، فیض کے خطوط، لوک گیتوں کی حکائی روایت، کلام شاہ مبارک آبرو، وغیرہ شامل ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا الفی قرآن مجید قرآن کا یہ خطی نسخہ عربی، فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک راجستھان میں محفوظ ہے۔ اس میں فن خطاطی کے اعلیٰ نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ ہر صفحہ کے نقش ونگار دوسرے صفحہ سے بالکل مختلف اور فنی اعتبار سے ممتاز ہیں۔ اس نسخہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر سطر کا آغاز 'الف' سے ہوتا ہے۔ سانگانیری کاغذ پر جرمنی روشنائی سے نہایت تزئین کاری کے ساتھ خوبصورت انداز میں اسے تیار کیا گیا ہے۔ اس نادر نسخے کی تفصیلات کو باقاعدہ تحقیق کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے گنیز بک آف ورلڈ رکارڈ میں اسے شامل کرنے کا منصوبہ تیار کرلیا گیا ہے۔

کتاب میں شامل ایک اور اہم موضوع پر مقالہ 'تزک بابری' یعنی بابر نامے پر مشتمل ہے۔ تاریخی اور تحقیقی حقائق پر مبنی اس مقالے میں ہندوستان کی مختلف تاریخی عمارتوں، یہاں کے شہروں، درگاہوں، موسموں، جانوروں، پہاڑی علاقوں، ندیوں، خوبصورت پرندوں، آب وہوا، سلاطین اور طرز حکومت کے علاوہ دیگر اشیا کا ذکر

مفصل اور مستند حوالوں کے ساتھ ملتا ہے۔ بابر کا طرز تحریر اور اسلوب نہایت ہی دلکش اور مفکرانہ ہے وہ مختصر، جامع اور معلومات افزا بیان پسند کرتا تھا۔ ترکی چغتائی زبان میں بابر کا دیوان بھی دستیاب ہے۔

'سرسید کا خط گراہم کے نام' نہایت ہی دلچسپ اور تحقیق طلب موضوع ہے۔ گراہم سرسید کا عاشق صادق تھا وہ سرسید کی شخصیت ان کی خدمات اور تعلیمی وژن سے بہت متاثر تھا۔

سرسید اور گراہم کے درمیان برسوں تک خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ ان خطوط کے ذریعہ سرسید کی ذاتی زندگی کے مختلف پہلو اور گوشہ سامنے آ سکتے ہیں اور خاطر خواہ تحقیقی مواد فراہم کیا جا سکتا ہے۔

ابتدا میں گراہم نے سرسید پر ایک مقالہ قلم بند کیا تھا بعد ازاں سرسید کی ایما پر گراہم نے انگریزی میں ایک مستقل اور جامع کتاب تحریر کی جو 'LIFE AND WORK OF SIR SYED AHMAD KHAN' BY GFI GRADHAM کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کا ایک نسخہ گراہم نے سرسید کو ارسال بھی کیا تھا۔ اس کے ذریعہ یوروپی ممالک میں سرسید کا تعارف اور خدمات کا اعتراف ممکن ہو سکا۔ انہیں خطوط کی روشنی میں موضوع کی مناسبت سے مختصر تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

جلیانوالہ باغ پر اردو اداریوں کی تعداد بہت کم ہے لیکن یہ اداریے تاریخی اور صحافتی نقطۂ نظر سے معلومات افزا اور اہمیت کے حامل ہیں۔ اس مضمون میں اس دور کے اہم اخبارات اور ان میں شائع ہونے والے اداریوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور چند نمونے بھی پیش کر دیئے گئے ہیں۔

گاندھی جی کے لسانی نظریے اور تعلیمی فکر پر بھی مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے ڈیسائی کلکشن میں گاندھی جی کے گیارہ زبانوں میں دستخط موجود ہیں ان میں اردو بھی شامل ہے۔ لفظ ہندوستانی اب تقریباً متروک ہو چکا ہے۔ یوروپین مصنفین

میں یہ لفظ زیادہ مستعمل تھا۔ گاندھی جی نے بھی اس دور کے لسانی تقاضوں کے مطابق لفظ ہندوستانی استعمال کیا ہے۔ ہندوستانی زبانوں کا باضابطہ آئینی اور لسانی سطح پر تعین کیا جا چکا ہے۔ اس کی لسانی درجہ بندی میں اردو کو باقاعدہ آئینی درجہ حاصل ہے۔

'حسرت کی متصوفانہ شاعری میں کرشن کا تصور' مضمون میں حسرت سے کرشن جی کی عقیدت اور متھرا میں حسرت کے قیام کا ذکر ملتا ہے۔ کرشن پر حسرت کی غزل کا یہ مصرعہ ''حسرت کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری'' بہت مقبول ہے۔ حسرت تہواروں کے موقع پر متھرا میں چند روز قیام ضرور کرتے تھے۔ اور اس نوع کی عقیدت کے اشعار بھی کہتے تھے۔

'لوگ گیتوں کی حکائی روایت کے موضوع پر شامل مضمون میں اردو کی حکائی روایت کو زیر بحث لایا گیا ہے بعض اہم تحقیقی پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو میں حکائی روایت کا بڑا مثبت تصور موجود ہے۔ اردو کے تہذیبی و سماجی اداروں نے زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں موثر کردار ادا کیا اور ادب کی حکائی روایت قائم کی۔ کتاب میں شامل اس نوع کے تحقیقی مضامین کی طویل فہرست ہے یہاں سبھی پر گفتگو کرنا ممکن نہیں۔

۱۲/جون ۲۰۲۳ء
علی گڑھ

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

WARSA FOUNDATION INTERNATIONAL

وَرثہ
فاؤنڈیشن انٹرنیشنل
WARSA FOUNDATION
INTERNATIONAL

لوک گیتوں کی حکائی روایت

ORAL TRADITION OF LOK GEET

لوک گیتوں کا جنم کہاں اور کیسے ہوا ان کا وجود کس طرح عمل میں آیا پہلا گیت کب لکھا گیا اس کی زمانی ترتیب کیا ہے اس کے لکھنے والے کون ہیں۔ لوک گیتوں کا قلمی نوشتہ یعنی خطی نسخہ دستیاب ہے یا نہیں۔ یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔

لوک ادب ہمیشہ مقامی DIALETS یعنی قصباتی اور دیہاتی لفظیات کی بنیاد پر پروان چڑھتا ہے۔ ہنسنا، گانا، رونا انسانی فطرت میں شامل ہے۔ رنج والم یا مسرت وانبساط کی کیفیت میں انسان غیر ارادی طور پر گانے یا گنگنانے لگتا ہے دیہاتی ہو یا شہری ہر انسان ایک دردمند دل رکھتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ شہریوں کے گیت راگ، راگنی، سرگم، سارنگی ستار، طبلے اور ہارمونیم جیسے آلات پر مبنی ہوتے ہیں جبکہ دیہاتی ڈھولک، تھالی، لٹیا، دست پناہ یا گھڑے ہی سے اپنا کام چلا لیتے ہیں۔ گمان غالب ہے کہ لوک گیتوں کا محرک پانی کے جھرنوں، آبشاروں، کی صداؤں، سمندروں کی لہروں، کلیوں کی چٹک، پتوں کی کھڑکھڑاہٹ، ہواؤں کی سرسراہٹ، جانوروں اور پرندوں کی مختلف النوع آوازیں انسانی آلات سے مطابقت رکھتے ہیں؟

لوک گیتوں کا لفظ ذہن میں آتے ہی عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ دیہی زندگی کے ترجمان ہوتے ہیں۔ ان کی لفظیات میں شہری تمدن اور سماجی تہذیب کی چھاپ نہیں ہوتی۔

اگر لوک گیتوں کی وجہ تسمیہ اور ابتدائی نقوش پر نظر ڈالیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ قدیم اور خصوصاً عہد عتیق میں راجاؤں امیروں اور بادشاہوں کے تزک واحتشام

اور جاہ وجلال کی تعریف توصیف میں چند اشعار ان کے شان میں پڑھے جاتے تھے ان کو گاتھیہ (गथयय) اور گانے والے کو گتھک (गथिक) کہا جاتا تھا۔ان میں سے چند اشعار عوام میں کچھ لوگوں کو یاد رہ جاتے تھے جو لوک گاتھیہ (लोकगाथयय) یا لوک گاتھا (लोकगाथा) کے نام سے موسوم ہوئے۔ غالبًا اسی لفظ سے لوک گیت (लोकगीत) کی تخلیق ہوئی۔ایک روایت یہ بھی ہے کہ اشومیگھ یگھ (अश्वमेघयज्ञ کی رسم کے موقع پر بھی لوک گیت گائے جانے کا رواج تھا اس طرح یہ گاتھائیں (गाथाएँ) سینہ بہ سینہ محفوظ ہوگئیں۔ ایک اندازے کے مطابق لوک گیت کا لفظ استعمال ہونے سے پہلے گرام گیت (ग्रामगीत) کا لفظ زیادہ مستعمل رہا ہوگا۔

انسانی وجود کے ساتھ ہی لوک گیتوں کا رواج عمل میں آیا۔ یہ عوام کے دلی جذبات کی آواز ہوتے ہیں جو خوشی اور غم کے موقع پر ان کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ گیت کو سکون قلب کا ایک فطری اور وجدانی ذریعہ بھی تصور کیا جاتا ہے۔ گیتوں کی ابتدا اتنی ہی قدیم ہے جتنی زبان اور تہذیب وتمدن کی تاریخ۔

گیت دراصل ایک ایسے خودرو پودے کی طرح ہے جو انسانی جبلت کے فطری عمل سے ماخوذ ہے۔ان میں شیرینی، مٹھاس، موسیقی اور نغمگی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔یعنی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو وہ شعر بن جاتا ہے۔ جو چیز دل پر استعجاب، حسرت یا جوش وجذبہ پیدا کردے وہ شعر ہے۔

گیت فطری طور پر ضرورت اور ماحول کے مطابق دلی جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ گیت میں دماغ کو قطعی طور پر دخل نہیں ہوتا یہ تو جوش و ولولہ کے ترجمان ہوتے ہیں۔ ان میں نہ منطق ہے نہ فلسفہ، نہ ردیف ہے نہ قافیہ نہ تشبیہ ہے اور نہ استعارہ، نہ عروض کی پابندی ہوتی ہیں اور نہ معانی ومطالب کی شعری بندشیں۔

عام طور پر لوک گیتوں کی زبان دیہاتی (دیہی) اور قصباتی ہوا کرتی ہے انہیں سماج کے کچھ پس ماندہ اور پیشہ ور طبقے مثلاً گھوسی، ڈفاتی مجاور، دھوبی، ملاح،

بنجارے مراثی، میواتی، نیوتی وغیرہ خوشی غم، مذہبی نیم مذہبی رسم ورواج کے موقعوں پر گیت قوالیاں الوادعیہ، رخصتی، سیہلے، چکرتے رنہانہ چھکڑتے۔ پچتے پٹا اور لاونی وغیرہ گاتے ہیں۔

لاونی، خیال اور کجری بنجاروں کے گیت ہیں پیشہ ور ذاتوں کے لوگ اس نوع کے گیتوں کو زیادہ اپناتے ہیں۔

گیت ایک ایسا فطری عمل ہے جو غیر ارادی طور پر ذوقی اور وجدانی کیفیت کے ساتھ ذہن کی پرتوں پر غالب آجاتا ہے دل گنگنانے لگتا ہے اور زبان سے بے ساختہ نغمے پھوٹنے لگتے ہیں لوک گیت ایک براہ راست فطری اظہار ہے جو سینہ بہ سینہ عوام کے ذہنوں میں محفوظ رہتا ہے یہ سرمایہ ضبط تحریر میں نہیں لایا جاتا۔

شاعری کی ابتدا نظم سے ہوئی اور گیت نظم کا نقش اول ہے۔لوک گیتوں میں ایک مخصوص قسم کا صوتی آہنگ ہوتا ہے۔اس کا لطف پڑھنے سے زیادہ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔اور وہ بھی ان رسم ورواج کے خاص موقعوں پر جو برمحل ہوں یعنی موقع محل تقریبات اور لسانی جہتوں کے مطابق لوک گیتوں کی تخلیق عمل میں آئی۔

محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو صفحہ ۴۴ پر یہ شعر درج کیا ہے ؎

سعدی کہ گفتہ ریختہ، در ریختہ دُر ریختہ
شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

گیتوں میں شعر کی فنی پابندیوں سے قطعی نظر ایک مخصوص قسم کا لطف ترنم، لحن شرینی، مٹھاس اور قدرتی سر پایا جاتا ہے۔اور اسے رکھیل نظم کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یعنی گیتوں میں شعریت، ابدیت، اور موسیقی کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔

موسیقی گیتوں کا جز ولاینفک ہے شاعری، موسیقی اور رقص تینوں فنون لطیفہ کے حسن امتزاج کا نام ہے۔

عبد القادر سروردی نے اپنی کتاب جدید اردو شاعری میں لی ریکل کے

عنوان سے ایک مضمون قلم بند کیا تھا ان کا خیال ہے کہ:

''گیت وہ نظمیں ہیں جو عموماً موسیقی اور رقص کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں لی ریکل شاعری کسی غور وفکر کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ پر جوش جذبات اس کا ماخذ ہے''

لوک گیتوں سے متعلق مولوی عبدالحق کے ایک خطبہ سے مندرجہ نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

اول یہ کہ گیت ادب کا ایک حصہ ہیں۔

دوم یہ کہ گیتوں میں سے بیشتر کی تصنیف کا سہرا عورتوں کے سر ہے۔

سوم یہ کہ گیتوں کی زبان الفاظ اور محاورے، تشبیہ اور استعارے عورتوں کے ایجاد کردہ ہیں۔ اور صنف نازک کی یہ زبان ہمارے ادب کا مشترکہ سرمایہ ہے۔

چہارم یہ کہ گیتوں کی زبان شگفتگی، حسن لطافت، نزاکت اور نوچ پایا جاتا ہے۔ زبان خوبصورت بھی ہو اور سبک بھی۔

پنجم یہ کہ گیتوں کے الفاظ اور محاورے بیشتر ہندی نژاد ہیں یا عربی فارسی سے ماخوذ ہیں۔ جو بظاہر ہندی کے گیت معلوم ہوتے ہیں وہ دراصل اردو کے گیت سمجھے جاتے ہیں۔ وزیر آغا نے مولوی عبدالحق کی رائے سے اتفاق کرتے ہوکوئے کہا ہے اب یہ غلط فہمی دور ہوگئی کہ لوک گیت ہندی سے مستعار ہیں۔

ششم یہ کہ گیتوں میں ژرف بیانی ہے۔ عورتوں کی نظر تیز ہوتی ہے اور چھوٹی سے چھوٹی خوبی یا کمزوری ان کی نظر سے بچ کر نہیں نکل سکتی لوک گیتوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ عورتوں نے مردوں سے زیادہ گیت لکھے ہیں، مردوں کے گیت الگ گائے جاتے ہیں جبکہ عورتوں کے گیت الگ ہوتے ہیں لوک گیت دراصل عورتوں ہی کے گیت ہیں۔

N. Hepple اپنی کتاب Lyric for Inenglilish میں اس طرح

اظہار خیال کرتا ہے۔

''گیت کا مرکزی وصف نغمگی ہے۔ دراصل جب احساس مترنم
لفظ میں سمویا جاتا ہے اور مترنم لفظ ترتیب وار ہوتے ہیں لوک
گیت جنم لیتا ہے گیت میں موسیقی نہیں بلکہ موسیقیت ہوتی ہے''

دورا کبری میں ریختہ کے معنی گیت کے لئے جاتے تھے اور دیسی لوک گیتوں کے اصل نمونے ظفر کی شاعری میں موجود ہیں۔

اردو میں لوک گیتوں کے آغاز کے سلسلے میں عام طور پر یہ خیال ہے کہ گیتوں کا آغاز امیر خسرو کے زمانے سے ہوا۔ ہندوی لہجے میں امیر خسرو کے ایسے لوک گیت ملتے ہیں مثلاً قال، قوالی خیال اور خیال راگ جو لوک گیتوں کا حصہ تصور کیے جاتے ہیں۔

اظہر علی فاروقی APOLOGUE اور اردو میں حکائی ادب ORAL TRADITION کے حوالے سے اپنی کتاب لوک گیت میں رقم طراز ہیں۔

''زبان اور بیانی خوبیوں کے علاوہ گیتوں کا طرز ادا اکثر و بیشتر مکالموں کی صورت میں ہے اور گیت سے مستقل طور پر کہانی کا لطف حاصل ہوتا ہے۔''

یعنی لوک گیتوں کے ذریعہ کہانیاں اور قصہ بھی سنائے جاتے تھے اور بعض گیتوں میں ادبی خوبیاں بھی نظر آتی ہیں۔

گیتوں کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے مثلاً بزمیہ، المیہ، رزمیہ، حزنیہ، لطف وانبساط، اضطراب، نفرت، ظلم وستم، غم وغصہ خوف اور اعتقاد وغیرہ۔

''عوامی گیتوں کے موضوعات زیادہ تر حزنیہ ہوتے ہیں ان میں عشق ومحبت کا بار بار ذکر آتا ہے لیکن انداز بیان میں پاکیزگی ہے۔ سرکشی نہیں غم روزگار کے شکوے بھی کہے جاتے ہیں لیکن ان میں بغاوت نہیں، تان صبر رضا پر ٹوٹتی ہے''

(بحوالہ مشرقی پاکستان کے لوک گیت کلیم اللہ، ماہنامہ خاور ڈھاکہ، اپریل ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۷)

گیتوں کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت بھی مسلم ہے۔ بعض گیت خاص موقعوں کی مناسبت سے ضبط تحریر میں لائے گئے مثلاً قومی یکجہتی، حب الوطنی اور بیشتر جنگ آزادی اٹھارہ سوستاون کے پرسوز واقعات اور تحریکات پر مبنی ہیں عوام کی زبان سے گائے گئے یہ گیت جنگ آزادی کے فروغ میں معاون ثابت ہوئے۔

حب الوطنی دو طرح کی ہوتی ہے مثلاً یہ کہ ہمیں اس جگہ کی مٹی سے بے پایاں محبت ہوتی ہے جہاں ہم پیدا ہوئے دوسرے یہ کہ کسی ملک کے لوگوں کی اپنے ملک میں حکومت کا ہونا اور غیر ملکی حکومت کو برداشت نہ کرنا اسے ایک اصطلاح میں وطنیت اور قومیت کے جذبے سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں حب الوطنی کی قدیم ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

دیس کا راگ سہانا ساتھی
باغ بغیچے پیارے مہکے
پیاری اک اک کیاری
جنگل جنگل سبزہ مہکے
پھول رہی پھلواری

(تیرے گیت، عشرت رحمانی ص،۶)

ارے چمکے مندروا میں چاند
مسجد میں بنسی بجے
چھوڑو سارے رگڑے جھگڑے

.....

اتی پتی چبا چبا کر جوجھ رہا ہے دیس
موت نے کتنے گھونگھٹ مارے بدلے سو سو بھیس

کال بکٹ پھیلائے رہا ہے بیماری کا جال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال
(سوز وساز۔حفیظ جالندھری)

ایسے عوامی گیتوں اور قصوں کا ذکر بھی ملتا ہے جن کی حیثیت خالص سیاسی تھی جنگ آزادی کے دوران قصبوں، دیہاتوں میں رونما ہونے والے خونچکا سانحات سے متاثر ہوکر عوامی سطح پر بے شمار گیت لکھے گئے جو جلسوں، جلوسوں، کھیت کھلیانوں، میدانوں، گلی کوچوں اور قید خانوں میں خوب گائے گئے لیکن ان گیتوں کا بیشتر سرمایہ ضائع ہوگیا۔

اٹھارہ سوستاون کی ناکامی کے بعد ہمارا ملک پوری طرح برطانوی سامراج کے شکنجے میں آ گیا غیر ملکی نو آبادیاتی حکومت نے معاشی استحصال کے علاوہ بھی ہندوستانیوں کی زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا تھا مغربی تہذیب کے سیلاب میں ہندوستانیوں کی صدیوں سے پرورش یافتہ تہذیبی، سماجی، اور اخلاقی قدریں بھی خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں اور پوری ایک صدی قدیم وجدید کی کشمکش میں گذری جس کا انجام مغربی صنعتی تہذیب کے غلبہ واقتدار کی شکل میں رونما ہوا۔انگریزوں نے اپنے نو آبادیاتی نظام کو مستحکم کرنے کے لیے جن تصورات کو فروغ دیا ان میں قومیت کا شعور بھی تھا جو ہندوستان کے حق میں آزادی کی نعمت کا مقدمہ ثابت ہوا۔

تحریک آزادی کے فروغ اور قومی شعور کی بیداری میں اردو زبان وادب کے عموماً اور دولوک گیتوں نے خصوصاً بڑا اہم اور موثر کردار ادا کیا۔

''باغی فوجیوں کا قومی گیت'' کے عنوان سے عظیم اللہ خاں کے گیت کے چند اشعار مثال کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔

ہم ہیں اس کے مالک ہندوستان ہمارا
پاک وطن ہے قوم کا جنت سے بھی پیارا

یہ ہے ہماری ملکیت ہندوستان ہمارا
اس کی روحانیت سے روشن ہے جگ سارا
کتنا قدیم کتنا نعیم سب دنیا سے نیارا
کرتی ہے زرخیز جسے گنگ وجمن کی دھارا
اوپر برفیلا پربت پہرے دار ہمارا
نیچے ساحل پہ بہتا ساگر کا نقارہ
اس کی کانے اگل رہی ہیں سونا، ہیرا، پارہ
اس کی شان وشوکت کا، دنیا میں جے کارہ
آیا فرنگی دور سے، ایسا منتر مارا
وٹا دونوں ہاتھوں سے پیارا وطن ہمارا
آج شہیدوں نے ہے ہم کو اہل وطن للکارا
توڑو غلامی کی زنجیریں برساؤ انگارا
ہندو مسلم، سکھ عیسائی ہمارا بھائی پیارا
یہ ہے آزادی کا جھنڈا اسے سلام ہمارا

انگریزوں کے جوروستم، جبر واستبداد اور شورش کے دوران انگریز فوجیوں کی طرف سے جو واقعات پیش آئے اس کی ایک دردناک صورت گدیوں کے ایک گیت دیکھئے جو چہکرا کے انداز میں ہے۔

تال تلیاں پٹ پٹ گئیں پھر گئیں چیلاں کی کونیاں
لال فرنگی کرچ دکھاویں گھونگھٹ والی نہوڑی پڑیں پلیاں
(بارہ ضلع مظفرنگر)

بظاہر یہ مبالغہ نظر آیا ہے لیکن اس کی تائید ظہیر دہلوی نے اپنی آپ بیتی میں اس طرح کی ہے۔ کہ جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے وہ مارے گئے عورتیں گھر سے نکل نکل

کر بچوں سمیت کنوؤں میں جا گریں چیلوں کے کنویں کے تمام کوچے لاشوں سے پٹ گئے آگے میرا قلم نہیں چلتا۔

ٹھائیں ٹھائیں بندوقیں گرجیں
کڑکڑ کڑکڑ کریں تلوار
میداں میں کودے صلابت اللہ
اور فرنگی ہوئے بڑے پریشان
ہم تو چلے چپر تلا میدان

ترائی کے گیت:

پکی پکی فصل کمپنی کے دلال کاٹ لیں گے
اور کھیتوں میں آگ لگادیں گے
پھر ہم بھوکھوں مر جائیں گے

اٹھارہ سوستاون کے واقعات سے متعلق ایک کھنڈ جو رام پور یوپی سے دستیاب چار ٹکے پر نوکر رکھ کر دین وایمان مٹادیں۔

دانتوں سے کرتوس توڑا ویں چربی سور کھلاویں
بھوسا گھاس بیچ بیچ کر بن گئے شاہ فرنگی
بن گئے شاہ فرنگی بھائی دیکھو وقت کے بلیاری
محلوں کی رہیے وانی پھریں ہزار پجاری
چار ٹکے پر نوکر رکھ کر دین و ایمان مٹا دیں
گورے بندر تن تن کے شہزادوں کو ناچ نچادیں
چار ٹکے پر.....

شہزادہ پر میر حسین قدر کے بارے میں دو مصرعہ بہت مشہور ہیں۔

میر حسین قدر بہادر دوسال تک لڑا ہاتھوں میں دونالی میداں میں تھا کھڑا

گدریوں کے چھکروں، گھوسیوں اور اہیروں کے برہوں اور پسر گیتوں میں ۱۸۵۷ کے واقعات کے نمونے کہیں کہیں موجود ہیں۔ سیاسی حالات کی بہترین ترجمانی ساکھا میں ہے۔ ان گیتوں کو عوامی رزم نامہ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ عام طور پر دستیاب نہیں ہیں۔

ہندوستان ایک وسیع وعریض ملک ہے ہر علاقہ کے گیت وہاں کی مقامی بولیوں (LOCAL DIALECT) اور رسم ورواج اور طور طریقوں کے مطابق ہوتے ہیں ان کا مفہوم، زبان وبیان اور لفظیات کو سمجھنا آسان نہیں ہوتا۔ لوک گیتوں کی زبان اور لفظیات پر جو Tribal Endangered Languages کے زمرے میں آتی ہیں ایک معیاری لغت یا فرہنگ تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

لوک گیتوں کا شمار فنون لطیفہ میں ہوتا ہے کیا لوک گیت شاعری کے فن پر پورے اترتے ہیں انہیں ادبی صنف کا درجہ حاصل ہے یا ایک بحث طلب موضوع ہے۔

لوک گیت عوام وخواص میں مقبول ضرور ہیں لیکن مقبولیت کے باوجود ان کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ اردو لوک گیت ہمارا تہذیبی سرمایہ ہیں جن کے تحفظ کی ذمہ داری موجودہ سماج پر عائد ہوتی ہے۔ لوک گیت علمی، سماجی، ادبی، لسانی، تہذیبی تمدنی اور ثقافتی ورثہ کا ایک اہم ARCHIVAL RECORD ہیں۔ عوامی تمدن کا ناگزیر حصہ تصور کیے جاتے ہیں۔

لوک ادب کی روایت حکائی ادب سے زیادہ پرانی ہے۔ عام طور پر اردو پر یہ الزام ہے کہ اس کا لوک ادب ہے ہی نہیں جبکہ اردو ہندوستان کی واحد زبان ہے جس کا ادب بولا بھی جاتا ہے اور پڑھا بھی جاتا ہے مثلاً مشاعرے، قوالی، غزل گائیکی، سوانگ، کہہ مکرنیاں، لوریاں، مرثیہ، داستانیں، ملفوظات، منظوم داستانیں قصے حکایتیں وغیرہ شامل ہیں۔

اردو میں لوک ادب اور حکائی ادب کی بڑی مثبت اور توانا روایت ملتی ہے، اس ادب نے اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں موثر رول ادا کیا ہے۔

☆☆☆

خواجہ الطاف حسین حالی اور تعلیم نسواں

خواجہ الطاف حسین حالی کو عام طور پر بحیثیت شاعر، نقاد، سوانح نگار اور سماجی مصلح تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن حالی کی شاعری کے جس قدر پہلو اور جہتیں اردو شعر و ادب کا حصہ ہیں ان میں سب سے اہم پہلو ان کی شاعری میں تحریک تعلیم نسواں اور مساواتِ نسواں کا تصور ہے۔ حالی اردو کا پہلا Feminist شاعر ہے جس نے اردو شاعری میں پہلی بار فیمنزم Feminist کا نظریہ پیش کیا تحریک تعلیم نسواں اور مساوات نسواں کے علمبردار کی حیثیت سے اپنی ایک الگ پہچان بنائی اور پہلی بار اس نوع کی اصلاحی موضوع کو اپنے تخلیقی پاروں میں جگہ دی۔ غالباً اسی لئے دور جدید میں حالی کے افکار و نظریات کا اطلاق (Relevence) بہت گہرا نظر آتا ہے۔

مولانا حالی کا مطالعہ بہت وسیع تھا انہوں نے تاریخ اسلام کے علاوہ عالمی سطح پر دیگر ادبیات اور مذاہب کا مطالعہ بھی بہ نظر غائر کیا تھا۔ حالی کے نظریات کو سمجھنے کے لئے اگر تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالیں اور عورت کے حوالے سے ماضی کے دریچے وا کریں تو اس ذیل میں عورت کی قدر و قیمت اور اہمیت کا تجزیہ اس طرح کیا جاسکتا ہے۔

ہندو Mythology کے مطابق سوم دیوتا نے اپنی ساری پاکیزگی عورت کو عطا کی، قوت گویائی اور مٹھاس گندھرو دیوتا نے دی، اگنی دیوتا نے عورت کو چمک دمک بخشی تاکہ یہ دنیا کی سب سے خوبصورت مخلوق بن سکے۔ علاوہ بریں دنیا کی تمام طاقتیں عورت سے منسوب ہیں۔ مثلاً دولت کو لکشمی سے، ذہانت ذکاوت کو سرسوتی سے اور درگا کو طاقت کی علامت کہا گیا ہے۔ مہابھارت میں عورت کو قابل احترام ہستی تسلیم کیا گیا ہے۔

آریہ سماج اور برہموسماج نے بھی تعلیم نسواں پر زور دیا۔ عیسائی مشنریوں نے ہمیشہ Women Education میں دلچسپی لی۔ چارلس ڈکن نے 1854ء میں اپنے ایک مشہور خط میں عورتوں کی تعلیم پر زور دیا ہے۔ عورتوں کی ترقی میں جن خواتین نے کارہائے نمایاں انجام دیے ان میں رکما بائی اور راما بائی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ایشور چندر ودھیا ساگر نے ودھوا آشرم کھولے، پارسیوں نے خواتین کے لئے مختلف قسم کی تعلیم فراہم کی۔ انڈین نیشنل سوشل کانفرنس نے عورتوں کی تعلیمی ترقی کے لیے مختلف اقدامات کیے۔

آریوں نے پرانوں میں عورت کا تذکرہ بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے۔ مسلم خواتین میں عطیہ بیگم، سعیدہ بیگم، اعلیٰ بی، اور سلطان جہاں بیگم فرمارروائے بھوپال تاریخ کے ایسے نام ہیں جنہیں مثالی کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

مسلم سلاطین نے عورت کے لیے محبت اور عزت کا اعتراف تاج محل کی شکل میں کیا۔

چودہ سو سال قبل قرآن میں سورۂ نساء کے ذریعہ تعلیم نسواں کا تصور ہم تک پہنچ چکا تھا۔ یہ تمام تاریخی شواہد وحقائق حالی کے پیش نظر تھے۔ حالی نے بھی اردو شاعری کے حوالے سے پہلی بار تعلیم نسواں اور مساوات نسواں کو نہ صرف اپنے فن پاروں کا موضوع بنایا بلکہ عملی طور پر بھی اس کا مثبت تصور پیش کیا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر زبان کی ابتدا نظم سے ہوئی۔ بعدازاں نثر کا ارتقا عمل میں آیا اردو زبان کے ابتدائی نمونے بھی نظم میں ملتے ہیں صوفی سنتوں نے بھی اپنا پیغام نظم کے ذریعہ عوام وخواص تک پہنچایا۔

مولانا حالی نے بھی عورتوں کے مسائل ومعاملات اور ان کی طرز معاشرت کو نظم کے ذریعے عام کرنے کی سعی کی۔ انہوں نے شعروادب کو محض مسرت وانبساط کا ذریعہ تصور نہیں کیا۔ وہ مقصدیت کے قائل تھے اور شاعری کی تاثیر سے فائدہ اٹھانا

ضروری سمجھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ شاعری زندگی کو بہتر بنانے اور اعلیٰ اقدار پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوسکتی ہے اور دنیا میں اس سے بڑے اور عظیم کام لئے جاسکتے ہیں۔

اپنے اس خیال کی تائید میں انہوں نے کئی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔فرانسیسی مفکر سارتر کا کہنا ہے کہ موسیقی اور مصوری سے صرف لطف لیا جاسکتا ہے اس سے پیغمبری کا کام نہیں لیا جاسکتا۔حالی نے سارتر کے اس نظریے کی شدت سے تردید بھی کی ہے۔

حالی ابن خلدون کی اس رائے سے بھی اختلاف کرتے ہیں کہ شاعری میں لفظ ہی سب کچھ ہے معنی کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔اس کے برعکس حالی کا خیال ہے کہ شاعری میں لفظ و معنی دونوں کی یکساں اہمیت ہوتی ہے۔

مذکورہ مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ حالی کا جھکاؤ ہمیشہ معنی کی طرف رہا ہے وہ شاعری میں پیغمبری کے قائل تھے۔

حالی نے مختلف سطحوں پر اپنے پیغام کا بیشتر حصہ نظم کے ذریعہ ہی پیش کیا تعلیم نسواں اور مساوات نسواں حالی کا اولین پیغام تھا اور وہ اسے ایک مشن (Mission) کے طور پر تصور کرتے تھے۔

حالی نے اپنے اس پیغام کو عام کرنے کے لیے جو تخلیقی فن پارے پیش کیے ان میں بیٹیوں کی نسبت، مسدس حالی، مناجات بیوہ اور چپ کی داد قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں مجالس النساء کے نام سے حالی نے ایک ناول بھی لکھا تھا۔نظم ''مناجات بیوہ'' میں ہندوستانی سماج کی ایک بیوہ کے مسائل اور اس کی ابتر حالت کو نہایت ہی پرسوز انداز میں پیش کیا ہے۔اس نظم کے ذریعہ انہوں نے ایک بے بس عورت کی آواز کو عوام و خواص تک پہچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

''چپ کی داد'' حالی کی تخلیقی کائنات میں واحد نظم ہے جس میں انہوں نے

عورت کی اہمیت اور اس کی تعلیم سے متعلق بڑی جامع اور موثر گفتگو کی ہے۔

اے ماؤں بہنوں، بیٹیوں، دنیا کی زینت تم سے ہے ملکوں کی بستی ہو تمہیں قوموں کی عظمت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں، شہروں کی ہو آبادیاں غمگین دلوں کی شادیاں دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے
فطرت تمہاری ہے حیا طینت میں ہے مہر وفا گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں، عبارت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو، محنت کی تم تقدیر ہو ہو دین کی تم پاسباں، ایماں سلامت تم سے ہے
تم آس ہو بیمار کی دھارس ہو تم بے کار کی دولت ہو تم نادار کی عسرت میں عشرت تم سے ہے
آتی ہو اکثر بے طلب دنیا میں جب آتی ہو تم پرمومنی سی اپنے یاں گھر بھر پہ چھاجاتی ہو تم
میکے میں سارے گھر کی تھیں گو مالک و مختار تم پر سارے کنبے کی رہیں بچپن سے خدمت گار تم
سسرال میں پہنچیں تو واں ایک دوسرا دیکھا جہاں جا اتریں گویا دیس سے پردیس میں اک بار تم
واں فکر تھی ہر دم یہی ناخوش نہ ہو تم سے کوئی اپنے سے رنجش کے کبھی پاؤ نہ واں آثار تم
بدلے نہ شوہر کی نظر سسرے کا دل میلا نہ آنکھوں میں ساس اور نند کے کھٹکو نہ مثل خار تم
غم کو غلط کرتی رہو سسرال میں ہنس بول کر شربت کے گھونٹوں کی طرح پیتی رہو خون جگر

عورت کی اہمیت کا احساس اس طرح بھی دلاتے ہیں ؎

وہ دین اور دنیا کے مصلح جن کے وعظ و پند سے ظلمت میں باطل کی ہوا، دنیا میں نور حق عیاں
وہ علم و حکمت کے بانی جن کی تحقیقات سے ظاہر ہوئے عالم میں اسرارِ زمین و آسماں

مرد، نیک ہو یا عورت کے ساتھ ان کا کیسا سلوک اور کس طرح کا رویہ رہتا ہے۔ حالی نے ان اشعار میں بیان کیا ہے۔

کی تم نے اس دارالمحن میں جس تحمل سے گزر زیبا ہے گر کہیے، فخر بنی نوع بشر
تم نے تو چین اپنے خریداروں سے بھی پایا نہ کچھ شوہر ہوں اس میں یا پدر یا ہوں برادر یا پسر
الفت تمہاری کر گئی گھر دل میں جس بے دید کے وہ بدگماں تم سے رہا، اے بدنصیبو عمر بھر

حالی نے جب ہوش سنبھالا تو انہیں اپنے اطراف زبوں حالی، سماجی ابتری اور بربادی کا سماں نظر آیا۔ عورتوں کی ابتر حالت سے وہ بہت مایوس ہوئے جس کا

اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے۔

گو نیک مرد اکثر تمہارے نام کے عاشق رہے — پر نیک ہوں یا بد رہے سب متفق اس رائے سے
جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں — آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
تم اس طرح مجہول اور گم نام دنیا میں رہو — ہو تم کو دنیا کی، نہ دنیا کو تمہاری ہو خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آب حیات — ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہر ہلاہل سر بسر
آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب — دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

حالی نے نہایت سادہ انداز میں گہری حقیقتوں کا دھیمے لہجے میں سچے اور کھرے جذبات کا اظہار کیا۔ حالی نے دل کو لبھانے والی بات نہیں کی بلکہ دل میں چبھنے والی بات کہی اور شاعری سے قوم کی اصلاح کا کام لیا۔

زمانۂ جاہلیت میں عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کی رسم بہت عام تھی حالی کے دردمند دل نے سماج کے اس الم ناک رویے کے اثر کو شدت سے قبول کیا اور ایک نظم ''بیٹیوں کی نسبت'' کے عنوان سے قلم بند کی۔

جاہلیت کے زمانہ میں یہ تھی رسم عرب — کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
سنگ دل باپ اسے گود سے لے کر ماں کی — گاڑ دیتا یہا زمین میں پسر زندہ جا کر
ساتھ بیٹی کے مگر اب پدر و مادر بھی — زندہ در گور سدا رہتے ہیں اور خستہ جگر

حالی نے اپنی زندگی کے اڑتیس برس سرسید کے ساتھ گذارے، وہ ذاتی طور پر بھی سرسید سے بہت متاثر تھے اگر چہ سرسید کے یہاں تعلیم نسواں کا عملی طور پر کوئی مثبت تصور نہیں ملتا۔ لیکن سرسید تعلیم نسواں کے مخالف نہیں رہے اور مساوات نسواں تو ان کے مشن کا ناگزیر حصہ رہا۔

رشید جہاں کے والد شیخ عبداللہ، پایا میاں نے علی گڑھ میں خواتین کے لیے جب ایک گرلس اسکول قائم کیا تو سرسید نے یہ کہتے ہوئے معمولی سا اختلاف کیا کہ ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ شیخ عبداللہ نے 1906ء میں ''خاتون'' کے نام سے

ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ البتہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں خواتین کے مسائل کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ اردو کے عظیم شاعر علامہ اقبال بھی یہ کہہ کر گذر گئے۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

یا

ہند کے شاعروں، صورت گر و افسانہ نویس آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

حالی نے انگریزی ادب سے جو کچھ اخذ کیا وہ نقل کی صورت میں نہیں بلکہ تصرف کی شکل میں ہے۔ حالی کے تخلیقی پارے شاعری کے علاوہ فکشن میں بھی موجود ہیں۔ مجالس النساء حالی کا ایک اہم ناول ہے جو بالترتیب سات مجالس پر مشتمل ہے۔ اس ناول میں عورتوں کے ساتھ مسائل و معاملات سے بحث کی گئی ہے۔ لیکن ناول کی تیسری مجلس میں عورتوں کی تعلیم سے متعلق خاطر خواہ بحث ملتی ہے۔

حالی وہ پہلے واحد مصلح قوم شاعر تھے جنہوں نے چہار دیواری میں قید ایک عورت کی بے بسی اور ناداری کو محسوس کیا اور اسے الفاظ کی بینائی عطا کی۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ عورتوں کے حقوق ان کی عظمت و حرمت کے تحفظ کا مسئلہ زیر غور رہا۔

حالی نے محسوس کیا کہ اگر عورت کو علم کی دولت سے محروم رکھا گیا تو مستقبل میں آنے والی نسلیں علم سے محروم رہ جائیں گی۔ اس سے ملک و قوم کی ترقی متاثر ہوگی۔ لہٰذا حالی نے عورت کو باعزت زندگی، مساوات ذہنی آزادی اور تمام تر سماجی حقوق کا مستحق قرار دیا۔

مولانا حالی حافظ قرآن تھے وہ مذہبی علوم کا بھی گہرا مطالعہ رکھتے تھے ان کے دردمند دل میں عورت کی عظمت اس سے محبت، اس کے حقوق کی پاسداری اور برابری کا احساس جاگزیں تھا۔ عورتوں کے تر حقوق کو انہوں نے نہایت ہی موثر طریقے سے عوام و خواص میں عام کیا اور اس عمل کی ابتدا انہوں نے بذات خود اپنے خاندان کی

عورتوں سے کی مثلاً شرعی اعتبار سے جائیداد میں عورتوں کا حصہ، شادی سے قبل لڑکیوں سے ان کی رائے لینا، جہیز کی مخالفت، بیواؤں، نادار عورتوں اور یتیم بچوں کے ساتھ حسن سلوک، ان کی عزت وحرمت کا تحفظ مزید یہ کہ عورتیں اپنے جن حقوق سے نابلد تھیں انہیں ان کے حقوق سے آگاہ کرانا۔ یہ وہ عزائم تھے جنہیں حالی ہمیشہ اپنی زندگی کا مشن تصور کرتے رہے اور تاحیات اپنے ان مقاصد کی تکمیل میں لگے رہے۔

ایک مجبور اور نادار عورت کے داخلی جذبات واحساسات کی ترجمانی وہی فن کار کرسکتا ہے جس کے دل میں عورت کی عظمت اور سماج میں اسے سربلند کرنے کا جذبہ جاگزیں ہو۔ اس جذبے میں ماں کی عظمت، بیٹیوں کی حوصلہ افزائی اور بہنوں کے حقوق شامل ہیں۔

حالی نے 1894ء میں پانی پت میں اپنے گھر سے متصل لڑکیوں کے لیے چوتھی جماعت تک ایک اسکول بھی قائم کیا تھا اس درس گاہ میں اردو، تاریخ، ریاضی کے علاوہ امور خانہ داری سے متعلق بھی مضامین مثلاً سلائی، کڑھائی ہوم سائنس وغیر کی تعلیم کا انتظام تھا۔ لڑکیوں کو تعلیم دینے کے لیے ایک عیسائی خاتون ٹیچر کا انتخاب کیا گیا لیکن چند برس بعد یہ اسکول بند کرنا پڑا۔ کیونکہ بچوں کے والدین نے عیسائی ٹیچر کو قبول نہیں کیا اور اس وقت کوئی مسلم خاتون ٹیچر دستیاب نہ ہوسکی۔ اسکول بند ہونے کی وجہ ہندوستان میں انگریزوں کی مخالفت تھی۔

حالی کی ازدواجی زندگی بھی بہت کامیاب تھی وہ ہمیشہ اپنے خاندان کی خواتین کو بڑی عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنی بیوی کے تند وتیز مزاج ہونے کے باوجود ان سے ہر بات پر مشورہ کرتے اور ہمیشہ ان سے بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتے۔

حالی اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے عورتوں کے حقوق کی پامالی کے خلاف آواز بلند کی وہ ہمیشہ Empowerment of Women کے نظریے پر قائم

رہے اور اس کی تلقین بھی کرتے رہے۔

آج وہی موضوعات و مسائل ہندوستانی سماج میں زیر بحث ہیں، عورتوں کا وجود آج بھی خطرے میں ہے۔ ان کی عزت و آبرو کا تحفظ ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔ مثلاً بیوگی کا مسئلہ، لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ، آبرو کے تحفظ کا مسئلہ، بزرگ ماں باپ کی بقاSurvival کا مسئلہ یہ وہ سب مسائل ہیں جن پر ہندوستانی سماج کو سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ وہی نظریات ہیں جو آج سے ڈیڑھ سو سال قبل حالی نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہندوستانی سماج کے سامنے پیش کیے تھے۔

وقار ادب، افتخار سخن، ناقد و سوانح نگار اور محبّ وطن حالی نے مسدس حالی میں پوری کائنات کو خدا کا کنبہ کہا ہے۔ ادب کے ہر گوشہ میں انہوں نے نئی راہیں تلاش کیں اور وہ ہمیشہ فکر و فن کی نئی جہتوں کے متلاشی رہے۔

''چپ کی داد'' حالی کی ایک ایسی شاہکار نظم ہے جو ان کے تعلیم نسواں اور مساوات نسواں کے نظریے کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ دور جدید میں حالی کے ان افکار و نظریات کی تفہیم و احتساب کی سخت ضرورت ہے۔ حالی کے ان نظریات کا نفاذ نہ صرف ہندوستانی سماج میں ناگزیر ہے بلکہ ان کے یہ افکار و نظریات عالمی سطح پر بھی مشعل راہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

☆☆☆

حسرت کی متصوفانہ شاعری میں کرشن کا تصور

حسرت ایک کھلی آنکھ کا شاعر ہے جس نے غزل کو سچ بولنا سکھایا اور اردو شاعری میں پہلی بار اپنے دیوان کے عنوانات قائم کیے۔ اساطیری علامات کے ذریعے اپنا پیغام دیا۔ عروض و آہنگ کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا۔ تہذیبی سطح پر یہاں کی اساطیر اور قدیم زندگی کو نئی جہت اور نئے پہلوؤں سے روشناس کرایا۔

اگر چہ عشق ایک عمومی موضوع ہے جو اردو کے کم و بیش ہر شاعر کے یہاں موجود ہے لیکن حسرت کے یہاں سنجیدگی، ملائمت، عشق کا احترام اور زیریلی کی کیفیت کا نہایت ہی خوبصورت اور لمسیاتی تصور ملتا ہے۔ جو نغمگی اور غنائیت سے تعبیر ہے۔ لہجے کی نرمی اور لطافت قاری کو یقیناً متاثر کرتی ہے۔

حسرت کی شاعری میں ان کی آپ بیتی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے:

شعر دراصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

حسرت کے یہاں تین موضوع بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

عشق، سیاست اور تصوف۔ حسرت کی زندگی اور ان کے مشاغل کو دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ وہ کوئی با قاعدہ صوفی نہیں تھے لیکن انہیں صوفیہ اور بزرگوں سے بڑی عقیدت اور محبت تھی اور صوفیہ کے مقامات مثلاً اجمیر شریف، کلیر شریف، بہرائچ اور فرنگی محل وغیرہ پر پابندی سے حاضری دیا کرتے تھے اور عرس میں بھی شریک ہوتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ وجدان کا مرہون منت ہے:

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

حسرت اپنے دیوان ہفتم کے طبع اول کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''حضرت شری کرشن علیہ الرحمہ کے باب میں فقیر اپنے پیر اور پیروں کے پیر حضرت سید عبد الرزاق بانسوی قدس سرہ کے مسلک عاشقی کا پیرو ہے۔''

حسرت اکثر و بیشتر اپنے پیرومرشد کی درگاہ پر حاضری کے لیے جایا کرتے تھے۔ بانسہ ضلع بارہ بنکی میں واقع ہے۔ رودلی فیض آباد کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ جو ہندی کے بلند پایہ شاعر عبدالقدوس گنگوہی کا وطن ہے۔ ہندی مثنوی دریاباد نس جواہر کے خالق قاسم شاہ کا مسکن ہے۔ پریم چنگاری کے مصنف شاہ نجف علی سلونی بھی بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ کاکوری میں مقیم شاہ محمد قاسم قلندر جنہوں نے شانت رس کی تخلیق کی قادریہ سلسلے کے ایک جید بزرگ تھے۔ ان کے فرزند شاہ تراب علی قلندر صوفی بزرگ اور ہندی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان تمام صوفی شعراء کو شری کرشن سے عقیدت تھی۔ ان صوفی ہندی شعراء نے مختلف انداز میں کرشن کی داستان عشق کو اپنے اشعار میں جگہ دی ہے۔ کیونکہ حسرت ان بزرگ صوفیہ کے مزارات پر حاضری دیتے تھے۔ انہوں نے ان کے کلام کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ اس لیے حسرت کی طبیعت پر ان صوفیہ کی تعلیمات کے اثرات مرتب ہونا یقینی تھا۔ حسرت سلسلۂ قادریہ کی ایک شاخ سے بھی منسلک تھے اور قادریہ سلسلے کی ہر شاخ کے بزرگ کے یہاں شری کرشن سے عقیدت ملتی ہے۔

ان بزرگوں نے کرشن بھگتی کی شاعری کی اصطلاحات کو مختلف پہلوؤں سے استعمال کیا ہے اور علامتوں کے ذریعے متصوفانہ معنویت سے روشناس کرایا ہے۔

صوفیہ سے عقیدت اور ان کے کلام کے اثرات حسرت نے بھی قبول کیے۔ انہوں نے گیتا کا بھی مطالعہ کیا اور تلک کی لکھی ہوئی گیتا کی تفسیر بھی پڑھی۔ جس کا ثبوت ان کے اشعار میں ملتا ہے:

ہر ہندو کا مضبوط ہے جی
گیتا کی یہ بات ہے دل پہ لکھی
آخر میں جو خود بھی کہا ہے یہی
پھر آئیں گے مہراج تلک

''زمانہ'' کانپور کے اکتوبر ۱۹۲۳ء کے شمارے میں حسرت کی ایک غزل شائع ہوئی تھی جس میں پہلی بار شری کرشن کا ذکر حسرت کی متھرا میں حاضری کے حوالے سے ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

آنکھوں میں نور جلوۂ بے کیف وکم ہے خاص
جب سے نظر پہ ان کی نگاہِ کرم ہے خاص
کچھ ہم کو بھی عطا ہو کہ اے حضرت کرشن
اقلیم عشق آپ کے زیر قدم ہے خاص
حسرت کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری
سنتے ہیں عاشقوں پہ تمہارا کرم ہے خاص

کرشن کے یہاں عشق کا تصور اسلامی تصوف سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے یہاں ایسی ماورائیت شامل ہے جو عشق کے حدود کو وسیع تر کرتی ہے۔ جو نہ خالص دنیاوی ہے اور نہ ماورائی۔ یعنی ان کے یہاں لمسیت بھی ہے اور ماورائیت بھی۔ انسانی جسم کا تقاضہ بھی عشق ہے اور وجدان کا تقاضا بھی عشق ہے۔ البتہ وجدان کا تقاضا ماورائیت کی طرف مائل کرتا ہے۔

Sister Navedita نے اپنی کتاب ''The Hindus and The Bhudist mythology میں اس موضوع سے تفصیلی بحث کی ہے اور بعض اہم نکات کی طرف واضح طور پر اشارے کیے ہیں۔

تلک نے گیتا کی تفسیر لکھتے وقت کرم مارگ پر زیادہ زور دیا ہے اور کرم مارگ

حسرت کے ذہن کو اپیل کرتا ہے۔

کلیات حسرت کے مرتب کا خیال ہے کہ

''حسرت کا خیال تھا کہ گیتا میں وراگ اور تیاگ پر زور نہیں دیا گیا ہے بلکہ شری کرشن عمل یعنی یوگ کے فلسفہ کی تبلیغ کرتے تھے اس لیے ان کے نزدیک گیتا اور اسلام کی تعلیمات میں قدرے یکسانیت پائی جاتی ہے۔''

غالباً یہی تصور تھا جس نے حسرت کو کرشن کا گرویدہ بنا دیا۔

صوفیہ کرشن کو نہ تو وشنو کا اوتار مانتے ہیں اور نہ ہی مجسم خدا، بلکہ صوفیہ کائنات کو ایک تکونی اکائی تصور کرتے ہیں جو حسن، عشق اور ہجر سے تشکیل پاتی ہے۔ اور بقول گیسو دراز عشق، عاشق اور معشوق تینوں کسی مقام پر ایک ہو جاتے ہیں۔ حضرت کرشن کائنات کا وہ مرکز ہیں جہاں حسن و عشق اور ہجر تحلیل ہو کر صرف کنہیا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ شری کرشن کے اسی تصور پر صوفی بزرگ شیدا ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی حسیت کے لیے کرشن اظہار و ابلاغ کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ تمام تر اظہار علامتی ہیں۔ (بحوالہ آج کل، مئی ۱۹۸۵ء ص، ۳۳)

انہیں علامتوں کی روشنی میں حسرت کے کلام کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ حسرت کے یہاں کرشن کے لئے مترادف الفاظ مثلاً کنھائی، بنواری، مراری، گردھاری، بہاری، شام، برج اور نندلال وغیرہ کا استعمال ملتا ہے۔

عبدالواحد بلگرامی نے یہاں تک کہا ہے کہ وہ کرشن اور ان کے نام کے مترادف سے صوفیہ کی مراد رسالت پناہ ہے۔''

حسرت نے کنہیا کا لفظ معشوق کے مترادف کے طور پر استعمال کیا ہے جو ان کی اپنی ندرت ہے۔

پارا تار پیا سے ملاؤ رزاق پیا، بانسے نگر یا کے بسّیا۔

بانسے نگر کے فرنگی محل کے
ایک نام کے دوئی کنھیا
رزاق وہاب پیا بن حسرت ہمری تبھا کا ہے کون سنیاّ

ترچھی نظر لکھنؤ، ۶ رفروری ۱۹۲۴ء

حسرت کے اشعار میں متھرا، گوکل، بندرابن، برسانہ اور نندگام جیسے مقام کا ذکر آیا ہے:

متھرا نگر ہے عاشقی کا دم بھرتی ہے آرزو اسی کا
ہر ذرہ سر زمین گوکل دارا ہے جمالِ دلبری کا
برسانہ و نندگاؤں میں کبھی دیکھ آئے ہیں جلوہ ہم کسی کا
پیغام حیاتِ جاوداں تھا ہر نغمہ کرشن بانسری کا

وہ نور سیاہ تھا کہ حسرت
سر چشمۂ فروغِ آگہی کا

''حقائق ہندی'' کے مصنف کے مطابق بانسری یا اس کے مترادف اس بات کی علامت ہیں کہ یہ ساری کائنات اسی وجودِ مطلق کی موسیقی کی آواز ہے یہ ''کن'' کا بھی مترادف ہے۔ حسرت نے کرشن کی بانسری کو انہی معنی میں استعمال کیا ہے کہ کرشن کی بانسری حیاتِ جاوداں کا نغمہ سناتی ہے۔

صوفیہ کی اصطلاح میں دیوالی یا ہولی ان کے ذکر سے عشق کے لطف و انبساط مراد لی جاتی ہے۔ حسرت کی ہولی میں بھی یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے:

شیام بھرے پچکاری
تھر تھر کانپت لاجن حسرت۔ دیکھت ہیں نرناری

حسرت کی متصوفانہ شاعری مختلف کیفیتوں، علامتوں، اشاروں اور اصطلاحوں کے ذریعے احوال عشق حقیقی اور مقامات معرفت کی جانب نشاندہی کرتی ہیں۔

☆☆☆

شاعرِ ہند۔فراقؔ گورکھپوری

تیرے اشعار پر سر دھنتی جائیں گی نئی نسلیں
بچا کر وقت رکھے گا یہ دستاویز انسانی

بیسویں صدی کے شعری منظر نامے میں فراقؔ گورکھپوری کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔فراق نے اردو غزل کو ہندوستانی تہذیب وتمدن سے روشناس کرایا نیز اردو شاعری کو نئے گل بوٹوں سے مزین کیا۔فراقؔ کی شاعری میں ہندوستان کی سوندھی مٹی کی مہک محسوس کی جاسکتی ہے وہ چاہتے تھے کہ اردو شاعری کو کسی طرح ہندوستانی تہذیب وثقافت کی روایتوں سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔

''پچھلی رات'' کے دیباچہ میں فراق نے اپنی شعری اور فکری کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

> ''میں نے اپنی غزلوں میں یہ چاہا ہے کہ اپنے اہل وطن کو ہندوستان کا اور ہندوستان کے مزاج اور روحِ عصر کا صحت مند تصور دے سکوں اور میری شاعری اس دھرتی کی شاعری رہے۔یعنی اس میں یہ دھرتی بولتی اور رقص کرتی ہوئی سنائی اور دکھائی دے جو کروڑوں سال پرانی ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ اپنے آپ کو تیار کرتی رہتی ہے۔جو سدا بہار اور سدا سہاگن ہے۔''

مذکورہ نقطۂ نظر کے تحت فراقؔ کے کلام میں ہندوستانی شعرا مثلاً کپل، بھاس، رامانج، بھرتری ہری، کالی داس، ودیاپتی بہاری، رحیم، میرا، جائسی، سورداس، بلھے شاہ، وارث شاہ، ٹیگور، حالی اور اقبال جیسے نابغۂ روز اور عظیم شعراء کی صدائے باز

گشت سنائی دیتی ہے۔

یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ فراقؔ کا شمار اس صدی کے بڑے شعراء میں ہوتا ہے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فراق نے اپنی شاعری میں ایک منفرد رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ رنگ ان کی رباعیات میں موجود ہے۔ جس کے ذریعہ انہوں نے ہندوستانی تہذیب وتمدن کو ایک نئے رنگ وآہنگ میں پیش کیا ہے۔

جہاں تک فراقؔ کی شخصیت کا تعلق ہے یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی کہ فراق اپنے تلامذہ سے خود اپنے فن اور شخصیت پر تنقیدی مضامین لکھوا کر ان کو مختلف ناموں سے شائع کرواتے تھے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فراق تنقیدی شعور نہیں بلکہ تخلیقی شعور رکھتے تھے۔

فراق مزاجاً بڑے لاابالی واقع ہوئے تھے ان میں غیر سنجیدگی بدرجۂ اتم موجود تھی نجی زندگی میں ان کے مسائل بہت الجھے ہوئے تھے۔ فراق بنیادی طور پر انگریزی کے استاد تھے ان کا ذریعۂ معاش انگریزی زبان وادب کی تدریس تھا انہیں انگریزی زبان جاننے پر بڑا فخر تھا وہ یقیناً انگریزی کے اچھے استاد سمجھے جاتے تھے۔ یہ واقعہ بھی سننے میں آیا ہے کہ فراق کہا کرتے تھے۔ ہندوستان میں صرف ڈھائی لوگ انگریزی جانتے ہیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشن، میں اور آدھی انگریزی پنڈت جواہر لال نہرو۔ انگریزی زبان وادب پر اتنا بڑا دعویٰ کرنے کے باوجود بھی فراق انگریزی زبان وادب میں اپنا مقام نہ بنا سکے ان کا انگریزی میں کوئی بھی ایسا تخلیقی کارنامہ بھی نہیں ملتا جس سے انگریزی ادب میں ان کی شناخت ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فراق کی انگریزی زبان وادب میں استعداد صرف درس وتدریس تک ہی محدود تھی۔ فراق میں بے شمار تخلیقی صلاحیتیں موجود تھیں۔ ان صلاحیتوں کا اظہار واخراج کسی نہ کسی طرح ہونا ہی تھا۔ غالباً اسی لیے انہوں نے اردو شاعری کو تخلیقی شعور اور صلاحیتوں کے اظہار کے لئے منتخب کیا۔ ایک انگریزی کا استاد جسے انگریزی زبان وادب پر عبور ہونے پر

بڑا ناز تھا۔ مجبوراً اردو میں اپنی شناخت بنا بیٹھا اور اس صدی کا ایک اہم شاعر شمار کیا جانے لگا۔

فراقؔ اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے، ان کے کلام میں ہندی اور سنسکرت کا بہت گہرا اثر ہے فراق نے اردو شاعری کو ہندی زبان کی لفظیات اور صوتیات کا بیش بہا خزانہ عطا کیا۔ چند اشعار مثال کے طور پر پیش کئے جا رہے ہیں ۔

یہ چندر ماہے کہ ماتھے کرشن کے ہے تلک
یہ جو ئے نور ہے، رادھا کا جلوۂ انوار
دنیا میں ہوئے اے دل کتنے ہی مہا بھارت
ارجن کی کماں تھا تو، بھشم کا تھا پیکاں تو
شیو کا وش پان تو سنا ہوگا
میں بھی اسے دوست پی گیا آنسو
ہرلیا ہے کسی نے سیتا کو
زندگی ہے کہ رام کا بن باس
جل جل کر آکاش دیپ بجھ گئے فراقؔ
پو پھٹتی ہے جیسے برہن کی چھاتی

فراقؔ کرشن کے گھنگرو کی جھنکار اپنے خون میں محسوس کرتے ہیں۔ اور رادھا کا دامن اپنے ہاتھوں سے پکڑتے ہیں ۔

ہے کرشن کے گھنگرو کی جھنکار مرے خوں میں
گیتی کی ہے رادھا کا ہاتھوں میں ترے داماں
لٹکے لٹکے کالے گیسو، گورے گورے لمبے بازُو
مل کے رواں ہے گنگ وجمن ساتھ خراماں رام لکھن

فراق نے صنفِ رباعی کو ایک نئی جہت عطا کی۔ انہوں نے اپنی رباعیات میں شرر نگار رس کو موضوعِ سخن بنایا۔ ہندوستان کی دیرینہ روایات اور تہذیب کے علاوہ ان کی رباعیوں میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کا استعمال بڑی خوبی اور روانی سے ملتا ہے۔ انہوں نے بڑی حسین نادر اور شگفتہ تشبیہات سے مرئی پیکروں کو سنوارا ہے فراق نے ایک جگہ لکھا ہے۔

''.....موقع بہ موقع نہایت ہی احتیاط سے سنسکرت الفاظ لائے جائیں لیکن اردو کی فصاحت میں بالکل فرق نہ آنے پائے۔''

فراقؔ غالباً اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کے کلام میں کالیداس اور بھاس سے لے کر کیشو داس، ہرناتھ ٹنڈن، تلسی داس اور بہاری کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

چڑھتی جمنا کا لہرا ہے کہ زلف
بل کھاتا ہوا سیاہ کوندا ہے کہ زلف
گوکل کی اندھیری رات دیتی ہوئی زلف
گھنشیام کی بانسری کا لہرا ہے کہ زلف

فراقؔ کی تخلیقات میں پریاگ و گوکل کی فضائیں، گنگا کا تقدس، مرلی کی صدائیں اور محبوب کی رمز و اشاریت موجود ہے

زلفِ شب گوں کی مہک پیکر کی چمک
دیپ مالا یہ سرِ گنگ و جمن کیا کہنا
کسی کے حسن کو آئی ہوئی ہو نیند جیسے
مرے اشعار میں انگڑائیاں لیتے اٹھا کوئی

فراقؔ نے اپنی شاعری میں چمک، دمک، رات سہاگ، امنگ، بھجنگ، دیپ مالا، دیپاولی، چندر مکھی، جوبن، سوگندھ، اور شالیمار، جیسے بے شمار ہندی لفظوں کا

استعمال کیا ہے۔

رنگین فضا، سنگار، درپن کی مثال
یوں اٹھنے کو ہے سکوت اچھلتا گلال
یہ شام یہ بزم ماہ یہ عہد و فا
جیئے مال پہناتے وقت سیتا کا جمال

فراقؔ کے یہاں اور خصوصاً رباعیوں میں ایک مخصوص قسم کی مانوس فضا اور خوشبو پائی جاتی ہے جو خالص ہندوستانی ہے

دیوالی کی شام گھر پتے اور سجے
چینی کے کھلونے جگمگاتے لاوے
وہ روپ وتی، مکھڑے پہ ایک نرم دمک
بچے کے گھروندے میں جلاتی ہے دیئے

فراق کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دوسری ادبیات سے استفادہ کیا اور اس کا تخلیق استعمال کر کے اردو میں بڑے خوبصورت مرقعے پیش کئے ہیں۔ دیرینہ تشبیہوں اور اصطلاحوں کو ایک نئے رنگ میں استعمال کیا ہے۔ فراق کا ایک شعر دیکھئے:

کرم یوگ کی مہا شکتی کو ہم نے اپنے ساتھ لیا
اس جیون کے شیش ناگ کو ان ہاتھوں نے ناتھ لیا

فراقؔ اردو دنیا میں ایک ایسی نئی آواز لے کر آئے جس کی بازگشت ادبیات عالم میں سنائی دیتی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے:

''ہندو سانیت کی روح اگر اردو شاعری میں سرایت کر سکے تو اس کی شاعری میں ایک معصومیت، کائنات وحیات کی ہم آہنگی ایک طہارت..... آجائیگی جس سے ایسے سنسار سنگیت پھوٹ نکلیں

گے جو سورگ سنگیت کو بھی مات کر دیں گے۔''

فراقؔ نے اردو شاعری کو ایک نئی سمت و رفتار دی اور اردو غزل کے ذہنی افق کو بلندی عطا کی ۔ یہ اچھوتا رنگ ان کے یہاں ہندی اور سنسکرت کے حوالے سے ماخوذ ہے۔

فراق نے فکر و نظر کو ایک نئی جہت دی الفاظ خستہ کو نئے معانی و مفہوم دیے۔ اور آواز آشنا کو ایک نئی نغمگی عطا کی ۔

آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی ہم عصرو
جب ان کو یہ دھیان آئے گا تم نے فراق کو دیکھا تھا

☆☆☆

پروفیسر نریش کی شاعری روایت سے جدت تک

ارسطو سے لے کر دور حاضر تک شاعری کی تعریف کے سلسلے میں مختلف ناقدین نے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے لیکن کسی بھی تعریف کو قطعیت کے ساتھ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ علم ہے کہ شاعری ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے، یہ ایک گہرا تجرباتی عمل ہے اس کی منطقی اور حتمی تعریف ممکن نہیں۔ شبلی کے خیال میں ''شاعری عام طور پر تخیل کے اظہار کا نام ہے۔ شبلی نے شعر کی منطقی تعریف یوں کی ہے کہ ''جو جذبات اظہار کے ذریعہ ادا ہوں وہ شعر ہیں'' میر نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

کہا تھا شعر کو پردہ سخن کا
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

ابن رشیق کے خیال میں شعر ایسا کلام ہے جو موزوں، منطقی اور غیر ارادی طور پر لکھا گیا ہو۔''

ولیم ہنزلٹ نے کہا تھا:

''شاعری تخیل اور جذبات کی زبان ہے۔ شاعری ایک وجدانی اور الہامی تخلیقی عمل ہے۔ یہ جذبات کا اظہار اشعار کی شکل میں ہوتا ہے۔''

مذکورہ بالا تعریفوں کی روشنی میں اگر نریش کے شعری مرتبے کا جائزہ لیا جائے تو بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ ''خوشبو کا سفر''، غم فردا، اور بازگشت، کا شاعر ایک اعلیٰ پائے کا تخلیق کار ہے۔

ڈاکٹر نریش نے ''خوشبو کے سفر'' کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

''تخلیقی عمل کا ایک پہلو یہ ہے کہ شاعر اور ادیب اپنی ذاتی زندگی کے غم

وآلام کے ساتھ ساتھ کتنے ہی دوسرے لوگوں کے رنج وغم جھیلتا ہے اپنی ہی زندگی میں اسے ایک ساتھ کتنی زندگیاں جینا پڑتا ہے اور پھر مختلف زندگیوں کے کرب کو وہ اپنے اندر اتارتا ہے اسے بھوگتا ہے اسے پچاتا ہے۔ بھوگنے اور پچانے کے اس عمل کو وہ معمولی سے غیر معمولی ہوتا رہتا ہے۔ اور بالآخر اس کے اندر کا پرایا کر جواب تک اپنا ہو چکا ہوتا ہے، تخلیق کی صورت اختیار کر کے باہر نکل آتا ہے۔ یہ غیر معمولی کتنا دردناک بھی ہے اور پر لطف بھی، نہیں معلوم اس سب میں سے کتنا کچھ اشعار میں دے سکا ہوں جواب تک بھوگ چکا ہوں، اندر اندر ابھی کیا پنپ رہا ہے کہہ نہیں سکتا جو پک چکا تھا وہ لفظوں کے جسم میں پیدا ہو چکا ہے باقی ناپید ہے۔''

ڈاکٹر نریش ابتدا ہی سے بڑے محتاط اور کم گو واقع ہوئے ہیں۔ تخلیقی اظہار کا جہاں تک تعلق ہے وہ اپنے اختیار سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ زبان سے لے کر بیان تک اور ہیت سے لے کر موضوع تک غرضیکہ ہر مقام پر ضبط وارتکاز سے کام لیتے ہیں۔

ڈاکٹر نریش ابتدا ہی سے تخلیقی ذہن رکھتے ہیں۔ ان کا تعلق مالیر کوٹلہ سے ہے جو ایک عرصہ تک پنجاب کی ریاست رہی۔ موصوف اردو ہندی اور انگریزی زبانوں پر ماہرانہ قدرت رکھتے ہیں۔ تینوں زبانوں میں ان کی تصانیف موجود ہیں، وہ بیک وقت محقق، نقاد، مترجم، ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، ناول نگار، اور شاعر ہیں۔ ان کی شاعری گذشتہ تین چار رہائیوں سال کی مشق سخن اور ریاضتِ فن کا نتیجہ ہے۔

اردو میں اب تک ان کی بارہ کتابیں اور کم وبیش دوسو مضامین انڈو پاک کے معیاری رسالوں میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ چند برس موصوف پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ، میں بھائی ویر سنگھ چیر پر بحیثیت چیئر مین کام کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر نریش کی شاعری قاری کے ذہن ودل پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ ان کے یہاں محاکات کی کارفرمائی، فطرت کی خیال انگیز عکاسی، الفاظ کا برمحل اور برجستہ

استعمال، کرب میں ڈوبے ہوئے خیالات قاری کو اپیل کرتے ہیں، مختلف اصناف میں طبع آزمائی، افکار میں پختگی، ایجاد و اختراع ان کے قادر الکلام شاعر ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ زندگی میں پیش آنے والے نہ جانے کتنے سانوں سے گزر کر انہوں نے شاعری کو پروان چڑھایا۔ ان کی شاعری کا پس منظر وجدانی کیفیات میں وہ زمانے کے ہنگامہ خیز واقعات سے متاثر نہیں ہوتے اس کے برعکس ان کے یہاں زندگی میں پیش آنے والے حقیقی واقعات کا منظوم اظہار ہے۔

نریش کی آواز زندہ اور توانا ہے۔ ان کے سوچنے اور بیان کرنے کا انداز اچھوتا اور نرالا ہے۔ زندگی اور سماج سے ان کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ ان کی شاعری ایک سدا بہار چمن ہے۔ جہاں کائنات کی رنگا رنگی اور فطرت کی بے محابا منظر کشی موجود ہے، نریش کا جمالیاتی شعور ان کی شاعری میں پوری آب وتاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ نریش کی شعری اقدار خصوصیات اور فن سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وہ ایک تخلیق کار ہیں اعلیٰ پائے کے ادیب ہیں زبان وادب کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں موضوع کا تنوع ہے، اشعار پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں ایک Sparking پیدا ہو جاتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

اپنے سائے سے بھاگنا ہوگا
کیا خبر تھی یہ حادثہ ہوگا

خاموشی کو زباں نہ دے اے دوست
گھر میں ہر وقت شور سا ہوگا

شہر سے گاؤں تک آ گی جب سڑک
آئینوں پر بہت دھول جمنے لگی!

نزولِ شام حقیقت کشی کا مظہر ہے
طویل اپنے سے سایہ دکھائی دیتا ہے

جذبۂ صحرانوردی سے تھک کے کب رکتا ہوں میں
پاؤں سے کانٹا نکلنے دے ابھی چلتا ہوں میں

خود سے بچھڑ کے ذات کے پیکر میں قید ہوں
گھر سے نکل گیا تھا مگر گھر میں قید ہوں

دائروں میں باندھ لو جذبات کا سیل رواں
ورنہ جذب عشق آشفتہ سری ہوجائے گا

ڈاکٹر نریش کے کلام میں جذبات کی فروانی احساسات کی شدت، خیالات کی لطافت، الفاظ کی نزاکت اور تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ ساتھ فکر وفن کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔تشبیہات واستعارات کی ندرت اور انداز بیان میں جاذبیت ہے، ان کی غزلوں میں فلسفیانہ تعلق، ایمائیت اور اشاریت ہے انہوں نے اخلاقی، مذہبی، قومی، اصلاحی، سیاسی ملکی اور تاریخی موضوعات پر لکھا ہے۔

یوں بھی ہم کو جستجو کی داد دلوائی گئی
آبلہ پائی ہمارا جرم ٹھہرائی گئی!

میں بھلا ہوں یا سرا انسان ہوں
آپ کے اس دور کا پہچان ہوں

پتھر اٹھا کے مجھ کو دکھانے سے پیشتر
یہ سوچ لے کہ میں ترا آئینہ دار ہوں

تو قلندر ہے تو پھر اس بات کا کیا غم تجھے
تیرے حصے میں ہے شہرت یا کہ ہیں رسوائیاں

تیرے جانے کے بعد برسوں تک
لب ترستے رہے خوشی کے لئے

رہبروں نے زمیں بانٹ لی ہے تو کیا لوگ بھی بٹ گئے ہیں
مسجدیں بے اذاں ہونے دو گانہ میں، تم جلاؤں وہاں آرتی کا دیا

نریش کی شاعری اسٹیج تک ہی محدود نہیں بلکہ دل کی آواز ہے جس کو دل بسمل کا پرسوز نغمہ کہا جا سکتا ہے اگر چہ وہ تلخ حقائق کو بیان کرتے ہیں لیکن ان کے یہاں تلخ نوائی نہیں پائی جاتی ۔

اگر ہے دعویٰ قلندری کا تو خستہ حالی سے عار کیوں ہے
وجود کا اتنا پاس کیوں ہے حیات سے اتنا پیار کیوں ہے
اگر تجھے علم ہے کہ رہزن امیر ہے تیرے کارواں کا
تو رہتے وہ رہبری کا جواب دے دعویٰ دار کیوں

نریش کا حسن جمال بہت پختہ ہے ان کا شعور ایک عام انسان کے شعور سے بالاتر ہے ۔

آیا خیال مجھ کو کبھی وصل کا اگر
احساس گونجتی ہوئی شہنائی بن گئی

نریش کا کلام روایت اور جدت کا حسین امتزاج ہے۔ ان کے طرزِ اظہار میں روایت کی پاسداری کے ساتھ ایک نئے پن اور تازہ کاری کا احساس ہوتا ہے۔ نریش نے زمانے کے کوائف و وسائل کو داخلیت کا رنگ دے کر غزل کی زبان میں

پیش کیا ہے۔ اگر چہ شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن بنیادی طور پر وہ غزل ہی کے شاعر ہیں۔

ڈاکٹر نریش نے فطری طور پر اس عہد کے ذہنی اور فکری رویوں پر اظہار و اسلوب کے پیرایوں کا اثر قبول کیا، باایں ہمہ اپنی شعری روایات سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔ روایت، جدت اور انفرادیت کا یہ حسین امتزاج نریش کی شاعری کا امتیازی وصف ہے جو کم شاعروں میں پایا جاتا ہے۔ اور یہ ان کے شعور کی بالیدگی اور فنی پختگی پر دلالت کرتا ہے۔

نریش کی شاعری ایک کلسٹر (Cluster) ہے، ایک ایسا حسین گلدستہ ہے جس میں مختلف رنگوں اور خوشبوؤں کے پھول سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ اس کی خوشبو سے ادبی دنیا ہمیشہ معطر رہے گی۔

☆☆☆

متین طارق باغپتی کا تخلیقی کرب

متین طارق باغپتی نے شاعری کو محض شوق کے طور پر برتا لیکن پیشہ کبھی نہیں قرار دیا۔ اس نوع کی شاعری سچی حقیقی اور طبع زاد ہوتی ہے۔ اور یہ طبع زاد شاعر تمام تر مصنوعی رویوں سے بہتر اور بالاتر تسلیم کیا گیا۔ انسانی اقدار کی پامالی کے خلاف قلم کو تلوار کی طرح برتا۔ مختلف النوع موضوعات پر نظمیں کہیں اور شاعری کا موضوع بنا کر نظم کے ذریعہ اپنا پیغام عوام وخواص تک پہنچایا اور اقبال کو اپنا آئیڈیل بنا کر غزل سے قطع نظر نظم کے میدان کو وسعت بخشی۔ متین طارق کا خیال ہے کہ غزل کے دو مصرعے شاعر کے مافی الضمیر کو تمام وکمال ادا کرنے سے قاصر ہو سکتے ہیں لیکن نظم میں جس قدر گفتگو کی جاسکتی ہے اور موضوعات کو سمیٹ کر منظر نگاری اور پیکر تراشی کے نمونے پیش کیے جاسکتے ہیں غزل کے ذریعہ وہ تاثیر پیدا نہیں کی جاسکتی غالباً متین طارق نے خاموش رہ کر مقصدی شاعری کو اپنے کلام میں جگہ دی عالمی اور آفاقی موضوعات کو شعری اظہار کا ذریعہ بنایا تاریخ وتمدن تہذیب وثقافت، حق و باطل، عزم واستقلال، یکجہتی وحب الوطنی، فطری مناظر، عظیم مذہبی شخصیات، تاریخی عمارتوں، اخلاقی قدروں، اور قائدین ملت، نوجوانوں سے خطاب جیسے موضوع ان کی شعری تخلیقات کے ترجیحات میں شامل رہے۔ ان کی بعض اہم تحریریں اور تخلیقات زندانی ادب کا حصہ ہیں۔ شاعر کا تخلیقی کرب نہ صرف شاعری بلکہ خطوط زنداں میں واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ متین طارق باغپتی نے سنگلاخ زمینوں، مشکل لفظوں، اور فکر وفن کی اعلیٰ درجات سے قطعِ نظر وہ عام فہم، سادہ سلیس زبان نہایت پر تاثیر انداز میں اپنے تخلیقی

کرب کا اظہار کر دیتے ہیں متین طارق کی شخصی نظموں میں نعت اور منقبت کے علاوہ بابر کا ایثار، ٹیپو سلطان، صلاح الدین ایوبی سے خطاب ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمت میں، اور مولانا علیم اختر مظفر نگری، نہایت ہی فکر انگیز اور تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔

متین طارق کی شاعرانہ خلاقی تخلیقی چابکدستی، وجدان کا سیل رواں ذوق و شعور کی الہامی کیفیات، ہمعات کی شکل میں قطرہ قطرہ ذہن کی پرتو پر یکجا ہو کر قلم کے ذریعہ قرطاس پر نئی شعری کائنات کی تخلیق کرتی رہتی ہیں۔ شاعر کا شعری ذہن تخلیقی کائنات کے ممکنہ پہلوؤں کو وسعت دے کر مبدا فیاض کی نت نئے شعری جہات سے مستفیض ہوتا رہتا ہے۔

اے مجاہد! اے صلاح الدین اے مردِ غیور!
تھا منور غیرت اسلام سے تیرا شعور!
مختصر یہ ہے کہ واہو ہم پہ راہ انقلاب
ملتِ اسلام ابھرے پھر مثال آفتاب

(نظم صلاح الدین ایوبی سے خطاب)

رعب و ہیبت کا یہ عالم ہے کہ تیرے نام سے
آج بھی تھر تھر ہیں پران کلیسا کانپتے
وہ کہ باہر وہ عظیم المرتبت وہ جنگو پیشہ
لقب تاریخ میں ہے فاتح ہندوستاں جس کا
شکست فاش دی تھی جس نے ابراھیم لودی کو
نمایاں کرکے دکھلایا تھا اوصاف دلیری کو
روایت ہے ہمایوں اتفاقاً حکم قدرت سے
ہوا بیمار کچھ ایسا کہ جاں کے پڑگئے لالے

چنانچہ سر جھکا کر عجز سے دربارِ باری میں
بصد منت کیا پھر عرض یہ سرکار عالی میں

خدا نے اپنی قدر کا کرشمہ سب کو دکھلایا
قریب المرگ بیٹا رفتہ رفتہ ہوگیا اچھا
(نظم بابر کا ایثار)

اے شہید حریت اے نازشِ سوزیقیں
ناز کرتی ہے تری ہستی پہ بھارت کی زمیں
بن کے چمکا غازۂ روئے وفا تیرا ! لہو
مرحبا صد مرحبا اے تیغِ زن! اے جنگجو
اے کہ تو ہے آج بھی شاہِ شہیدانِ وطن
دے ہمیں بھی لشکر اعدا سے پھر حکم بزن
مختصر یہ ہے کہ اے روح روان انقلاب
بن کے آجا آج پھر باطل کے حملوں کا جواب
(ٹیپو سلطان)

متین طارق کی شعری کائنات پر اقبال کا رنگ مکمل طور پر غالب نظر آتا ہے۔ انہوں نے اقبال کی شعری سرحدوں کو چھونے کی متعدد بار کوششیں کی ہیں جگہ جگہ نظموں اور موضوعات کے حوالے سے شاعری میں ان کی اس کاوش کا گمان ہوتا ہے چند اشعار نظم اقبال سے۔

ہمارے کارواں کے واسطے بانگِ درا تو تھا
کہ روح آدمیت زندگانی کی صدا تو تھا
خودی کے سرمدی پیغام کی تبلیغ کی تو نے

قلم کے زور سے اسلام کی تبلیغ کی تو نے
حقیقی حسن بخشا تو نے اردو کی لطافت کو
سمویا شعر کے پیکر میں پیغام صداقت کو
خرد کو عشق کا عرفاں ہوا تری صداؤں سے
جنوں کو عقل کی حکمت ملی تری نواؤں سے
ترا سرمایۂ دانش رہے گا مدتوں باقی
(نظم اقبال)

اے امیر محترم! اے رہنمائے بے بدل
اے صداقت کے مبلغ ! پیکر عزم وعمل
اے کہ تو تھا کاروانِ عشق کا روح رواں
تیرا اک اک لفظ تھا ملت کے غم کا ترجماں
اہل حق پہچانتے ہیں سب تری آواز کو
منکشف تو نے کیا ہے دین حق کے راز کو
تری تحریریں ہیں باطل کی دلیلوں کا جواب
تیرا انداز خطابت تھا مثال آفتاب
مرحبا! ہے کس قدر فکر آفریں تیرا پیام
اے علمبردار دین حق تجھے لاکھوں سلام
(نظم ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمت میں)

فضا مغموم ہے اجڑی ہوئی فصل بہاراں ہے
نگاہوں میں اداسی ہے چراغ دل پریشاں ہے
غم وحسرت کے بادل چھارہے ہیں آج آنکھوں میں
ہزاروں اشک ڈھل کر آرہے ہیں آج آنکھوں میں

معمر نیک سیرت تھے حسیں کردار رکھتے تھے
جگر میں سوز رکھتے تھے دلِ بیدار رکھتے تھے
جلالِ درگہ حق سے یہی ہے اب دعا میری
زیارت گاہِ اہل علم و دانش ہو لحد ان کی
ملے جنت کی وادی میں کہیں دارالسلام ان کو
خدا بھی ان سے راضی ہو ملے اعلیٰ مقام ان کو

(مولانا علیم اختر مظفرنگری)

تاریخی شخصیات پر یہ شخصی نظمیں جن کے جستہ جستہ اشعار مثال کے طور پر پیش کیے گئے۔ نہ صرف انہیں خراج تحسین پیش کرتی ہیں۔ بلکہ نظموں کے ذریعہ ان کے کارناموں کے تعارف بھی کراتی ہیں جو نئی نسل کے لیے مشعل راہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

متین طارق کے کلام میں سادگی و سلاست کے ساتھ ساتھ تخلیقیت کے شعری امتیازات ان کے فن کو ممیّز کرتے ہیں۔ متین طارق کا قلم ایک فن کار کا قلم ہے ان کا مزاج ایک مصلح اور مفکر کا مزاج ہے ان کی اصابت فکر ایک سچے اور کھرے تخلیق کار کی فکر ہے۔ دانشوری اور ذکاوت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

اقبال کے موضوعات اور احسان دانش کی شعریات ان کے تخلیقی نظام کا حصہ تصور کیے جاسکتے ہیں۔

متین طارق کا تخلیقی کرب شاعری تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اظہار ان کی دیگر تحریروں اور خصوصاً خطوط کی شکل میں بھی ملتا ہے۔ اردو جو زندانی ادب کا حصہ کہا جاسکتا ہے۔ متین طارق کے مکاتیب، خطوط زنداں کے نام سے شائع ہوئے ہیں جنہیں ان کے لائق فرزند ڈاکٹر ذکی طارق نے مرتب کیا ہے۔ جو مختلف اوقات میں میرٹھ کی سینٹرل جیل سے احباب واعزا کے نام لکھے گئے ہیں۔

اب ڈاکٹر ذکی طارق اپنے والد ماجد متین طارق باغپتی کے فکر وفن اور

شخصیت پر ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں برسوں سے ادبی حلقوں سے اس نوع کی کتاب کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ امید ہے کہ اس کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد کسی حد تک متین طارق کی ادبی خدمات کا حق ہو سکے گا۔ اور آنے والی نسلوں کے لیے اس شاعر کے بارے میں خاطر خواہ مواد کی فراہمی کا باعث ہو سکے گی۔ نیز کتاب پر ایک دستاویزی (Archival Record) حیثیت کی حامل ہوگی۔

یاد سے تری دل درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

☆☆☆

اردو میں خاکہ نگاری: ایک تاریخی جائزہ

خاکہ نگاری ایک ایسا تخلیقی فن ہے جو لفظوں کے ذریعہ قاری کے ذہن میں کسی بھی شخصیت کا بھرپور اور مکمل تصور اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ تصویری شکل میں پیش کرسکتا ہے۔ اس فن کا اطلاق صرف نثر میں ہوتا ہے کیونکہ یہ فن پیکر تراشی سے بالکل مختلف ہے پیکر تراشی کے فن کا اطلاق شاعری تک محدود ہے۔

انیسویں صدی کا نصف آخر اردو ادب کا نشاۃ ثانیہ قرار پایا ہے۔ اس حدِ فاصل سے اردو کی کئی اہم اصناف نے جنم لیا اور چند روایتیں بھی قائم ہوئیں اور یہ روایتیں سرسید تحریک کی مرہون منت ہیں مقدمۂ شعروشاعری کے خالق اور اردو کے اولین نقاد خواجہ الطاف حسین حالؔی ہیں تو آبِ حیات کے مصنف اور اردو کے پہلے خاکہ نگار محمد حسین آزاد کی تحریروں میں اردو میں خاکہ نگاری کے اولین نقوش محمد حسین آزاد کے یہاں موجود ہیں۔ اور اس روایت کی پاسداری کے طور پر عبدالحلیم شررؔ، مرزا ہادیؔ رسوا جنہوں نے مختصر نویسی Urdu short Hand پر پہلی کتاب تصنیف کی اور خواجہ حسن نظامی نے اس فن کی آبیاری کی لیکن جدید خاکہ نگاری کی ابتدا مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکوں سے ہوتی ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں شخصی خاکوں کی جانب اپنی توجہ مبذول کی اور شخصی خاکہ نگاری کے فن کو اردو میں ایک مستقل فن اور صنف کے درجے تک پہنچادیا۔

نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، اردو کا ایک گراں قدر تخلیقی کارنامہ ہے، انہوں نے اردو میں خاکہ نگاری کا ایک نیا باب قائم۔

اس میں اگر چہ بعض کوتاہیاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں ان خامیوں کو اس لیے نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ اس سے قبل اردو میں خاکہ نگاری کے حوالے سے اس

نوع کا کوئی مکمل نمونہ نہیں ملتا نذیر احمد کی کہانی کے منظر عام پر آنے کے بعد ان کے معاصر ادیبوں نے اس صنف کی طرف توجہ مرتکز کی اور اس کے ارتقا میں حصہ لیا۔

۱۹۲۹ء میں آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے چند مضامین نشر کئے گئے جو علامہ راشد الخیری، ڈپٹی نذیر احمد اور ملا واحدی نے تحریر کئے تھے۔

اردو خاکہ نگاری کا ایک اہم نام آغاز حیدر حسن کا ہے انہوں نے تجربہ کے طور پر اردو میں متعدد خاکے تحریر کئے ان میں سے چند خاکے ان کے مضامین کے مجموعے ''پس پردہ'' میں بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کی گئی تھی۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بھی اس صنف کی طرف توجہ دی ان کے خاکوں کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' کے نام سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ ''چند ہم عصر'' عبدالحق کا ایک منفرد تخلیقی کارنامہ ہے۔ جسے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اس مجموعے میں چوبیس مختلف شخصیتوں پر خاکے شامل ہیں۔

مولوی عبدالحق کے مرقعوں میں خاکے کی جو نمایاں خصوصیات ملتی ہیں ان میں ایک تو شخصیت کی عکاسی میں غیر جانبداری ہے دوسرے ان کی شخصیت سے ہمدردی کا عنصر ہر خاکے میں موجود ہے۔ ان کی تحریروں میں شخصیت اور مزاج واضح طور پر نظر آتا ہے۔ مولوی عبدالحق معائب اور محاسن کو بیان کرنے میں غیر جانب دار ہیں وہ دوستی، تعلقات، شخصیتوں کی عظمت اور شہرت کی پرواہ نہیں کرتے اور عام آدمی کی شخصیت پر بڑی دیدہ ریزی اور انہماک سے قلم اٹھاتے ہیں جس کی بہترین مثال ''چند ہم عصر'' میں شامل نور خاں کے خاکے سے دی جاسکتی ہے۔ نور خاں اگر چہ ایک معمولی سپاہی ہے لیکن یہ خاکہ اردو کا ایک معروف اور دلچسپ خاکہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس خاکے میں عبدالحق نے ایک ہندوستانی سپاہی کی سچی اور جیتی جاگتی تصویر نہایت ہی منفرد اور دلچسپ انداز میں پیش کی ہے خاکہ کی چند سطور مثال کے طور پر دیکھئے:

''نور خاں کی نیک نفسی، حق گوئی، خوداری، شرافت، ایمانداری اور مزاج کے تیکھے پن نے زندگی بھر انہیں مصائب اور آلام میں گرفتار رکھا، ان کی گردن کئی بار کٹی مگر تبھی ایک دفعہ بھی نہیں وہ حساب کے اول اور دل کے کھرے تھے۔''

آخر میں عبدالحق نور خاں کی قدر افزائی کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں کاش ہم میں سے بہت سے نور خاں ہوتے۔''

روزمرہ کے محاورے اور معمولی متروک الفاظ کے استعمال پر مولوی صاحب کو جس قدر قدرت حاصل تھی اسی طرح ان کا اسلوب بھی منفرد ہے۔ وہ جس مضمون کا خیال کرتے ہیں اس کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی، سلاست روانی، رنگینی اور بے تکلفی کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص قسم کا رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے۔ کسی بھی صنف میں ان کی طبیعت کی جولانی اور قلم کی روانی میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔ عبدالحق کے خاکوں میں معروضی انداز بیان اور اس سے بڑھ کر ذاتی اور عقلی فیصلے کا منفرد اسلوب ملتا ہے۔ بعض اوقات وہ تنقید اور طنز سے بھی کام لیتے ہیں۔

مولوی عبدالحق کے علاوہ اردو خاکہ نگاروں میں خواجہ محمد شفیع بشیر احمد ہاشمی، خواجہ غلام الدین، عبدالرزاق کانپوری، عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ادبی رجحانات کے ذیل میں عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، اشرف صبوحی، دیوان سنگھ مفتوں، شوکت تھانوی، اعجاز حسین، چراغ حسن حسرت، تمکین کاظمی، غلام احمد، فرقت کاکوروی، رئیس احمد جعفری، محمد طفیل، عبدالمجید سالک، ضیا احمد بدایونی، شاہد احمد دہلوی، علی جواز زیدی، عبدالاحد خاں تخلص، معین الدین دروانی، نریش کمار شاد پروفیسر نورالحسن نقوی قمر الہدی فریدی اور مجتبیٰ حسین کے نام خصوصیت کے حامل ہیں۔ ان خاکہ نگاروں نے اس صنف کی طرف نہ صرف بطور خاص توجہ دی بلکہ خاکہ نگاری کی صنف میں اپنی اہمیت کا لوہا منوایا۔

خاکہ نگاری کے محرکات، مقاصد، ہیت مواد، پیرایۂ بیان اور ادبی تکمیل کو پیش نظر رکھا جائے تو شخصی خاکوں کو مختلف اقسام مثلاً تعارفی خاکے، سرسری خاکے، تاثراتی خاکے، مزاحیہ اور توصیفی خاکے، ذاتی یا خودنوشت خاکوں کے ذیل میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

خاکے کے لئے ضروری ہے کہ صرف خاکہ ہو، مختصر افسانہ نگاری کا ایک فنی وصف اس کا اختصار ہے۔ اختصار سے محض لفظوں کی کفایت مراد نہیں بلکہ ایسی کفایت الفاظ مراد ہے جس میں دریا کو کوزے میں بھرنے کی کیفیت ہوتی ہے ایک اچھے خاکے میں کفایت کا یہ عمل زبان کے علاوہ خاکے کے تمام تر اجزاء میں نمایاں رہتا ہے۔ مثلاً یہ کہ خاکہ نگار کسی شخصیت کی زندگی کے محض چند واقعات چن لیتا ہے ایسے خاکہ سے شخصیت کا تمام وکمال حق ادا نہیں ہوتا۔

کسی شخصیت کا ایسا خاکہ یا مرقع پیش کرنا جو مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ جامع بھی ہو۔ مختصر اس طرح کہ قاری اسے ایک نشست میں پڑھ ڈالے اور ایسا جامع ہو کہ اس کی شخصیت کا کوئی بھی پہلو تشنہ نہ رہے اور نظر انداز بھی نہ ہونے پائے۔

وحدت تاثر خاکہ نگاری کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ نقادوں کی تحریروں میں عموماً تین وحدتوں کا ذکر ملتا ہے۔ وحدت تاثر سے متعلق سید احتشام حسین کا خیال ہے کہ اسے چوتھی وحدت قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ تینوں وحدتوں کا اصل مقصد وحدت تاثر کا پیدا کرنا ہے اس لئے یہ وحدت پہلی تین وحدتوں کا لازمی اور منطقی نتیجہ کہی جاسکتی ہے۔

جہاں تک خاکے میں کردار نگاری کا تعلق ہے خاکے کے جملہ عناصر ترکیبی میں کردار نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے خاکے کا موضوع کوئی بھی شخصیت ہوسکتی ہے اور یہ شخصیت اپنی انفرادی خصوصیات رکھتی ہے۔ ان خصوصیات کو اجاگر کرنا ہی در اصل خاکہ نگاری کا اہم منصب ہوتا ہے اس لحاظ سے خاکہ میں کردار کی بڑی اہمیت ہے۔ اور کردار خاکے کا ایسا جز ہوتا ہے جس کے بغیر خاکے کا تصور ممکن نہیں ہوسکتا۔

اس موقع پر سر تھامس اوپری کا ذکر بھی کرتے چلیں جو ایک کامیاب خاکہ نگار تھا اس کا زمانہ ۱۶۳۰۔۱۵۸۰ء کو محیط ہے۔اس نے خاکے میں کردار کی تعریف اس طرح بیان کی ہے:

''خاکہ ایک تصویر ہے حقیقی یا شخصی جیسے مختلف رنگوں میں اتارا جاسکتا ہے۔اور یہ سب ایک سایہ اور عکس سے جگمگا اٹھتے ہیں۔''

یہاں تھامس اوپری کی نصف رائے سے اتفاق کیا جاسکتا ہے مثلاً ''خاکے کو مختلف رنگوں میں اتارا جاسکتا ہے اور یہ سب ایک سایہ عکس سے جگمگا اٹھتے ہیں۔لیکن یہ کہنا کہ خاکہ ایک تصویر ہے حقیقی یا شخصی غلط تجربہ پر محمول ہے کیونکہ خاکہ شخصیت کی سچی، حقیقی شخصی تصویر ہے، جس میں غلط بیانی کی گنجائش ممکن نہیں۔

بہرحال واقعہ نگاری کے ذیل میں خاکے میں محض کسی شخص کی سیرت اور کردار کی خصوصیت بیان نہیں کی جاسکتی بلکہ پڑھنے والوں کو ان کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے۔اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر کردار کی خصوصیت کو واقعاتی پس منظر کے ساتھ پیش کیا جائے۔

خاکہ نگار کے لئے ایک اچھا واقعہ نگار اور قصہ طراز ہونا بھی ضروری ہے خاکے سے دلچسپی اور اثر انگیزی کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہوتا ہے کہ واقعات کو سلیقے سے بیان کیا گیا ہو۔ بیان ایسا ہونا چاہیے کہ پڑھنے والے کو واقعہ اپنی نظروں کے سامنے ہوتا ہوا دکھائی دے کیونکہ واقعہ نگاری میں کئی باتوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ ایک تو واقعہ کا وقت دوسرے وہ مقام جہاں پر واقعہ پیش آیا ہو۔ واقعہ نگار اپنے زورِ قلم سے گزرے ہوئے واقعہ کو اس طرح بیان کرے کہ گویا وہ واقعہ اسی وقت پیش آرہا ہو۔ اور قاری اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ واقعہ نگاری کی عام طور پر دو قسمیں بتائی گئی ہیں۔

واقعہ نگاری کا فن یہ ہے کہ واقعہ نگار کسی واقعہ کو بے کم و کاست بعینہٖ اپنے

الفاظ میں نہایت سلیس، پر اثر اور خوبصورت انداز میں پیش کرے۔ اس کے لئے خاکہ نگار کی زبان و بیان پر ماہرانہ قدرت ہونا ضروری ہے۔ واقعہ اجمالاً معلوم ہو لیکن واقعہ نگار کے تمام جزئیات اور حالات و کوائف اپنی قوتِ آخذہ سے پیش کئے جائیں جو بامعنیٰ اور ادبی انداز رکھتے ہوں۔

منظر کشی ایک مستقل فن ہے خواہ وہ شاعری میں ہو یا نثر پاروں میں لیکن خاکہ نگاری میں منظر کشی کی ایک الگ اہمیت ہے اور خاکہ میں منظر کشی بھی واقعہ نگاری کا ایک لازمی جز ہے۔ منظر اس کیفیت کا نام ہے جو متعدد واقعات یا واقعہ کے متعدد جزئیات کے مجموعے سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی کسی کیفیت کا بیان منفرد اور اچھوتے انداز سے الفاظ کے ذریعہ اس طرح کیا جائے کہ اس کی تصویر اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ آنکھوں کے سامنے ابھر آئے اس کی مثال مختلف مناظر سے بھی دی جاسکتی ہے۔ مثلاً دریا کی روانی، جنگل کی ویرانی، باغ کی شادابی، سبزہ کی لہک، چڑیوں کی چہک، پھولوں کی مہک اور تاروں کی چمک وغیرہ۔

اختصار خاکے کا جز ولاینفک ہے اور خاکے میں اختصار پیدا کرنا ایک مشکل امر ہے اس کے لئے صحیح قوت فیصلہ، انتہائی اہم اور ضروری باتوں کے انتخاب کا سلسلہ اور الفاظ، کیفیات و واقعات کا ترتیب وار سلیقہ درکار ہوتا ہے۔

خاکہ نگاری کے لئے وحدت تاثر، ہیت، اختصار، طوالت، اسلوب، فن، تکنیک، موضوع اور مواد پر یہ سب ناگریز جزئیات تصور کی جاتی ہیں۔

گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے کہ خاکہ نگاری کا فن صرف نثر تک ہی محدود ہے۔ لیکن خاکوں کے چند نمونے نظم کی شکل میں بھی ملتے ہیں جو خاکے کے تقاضوں، فن اور معیار پر پورا نہیں اترتے مثلاً ظفر علی خاں نے ۱۸۴۴ء میں خواجہ حسن نظامی کا ایک منظوم خاکہ تحریر کیا تھا جس میں مذہب کے حوالے سے ان کی ذاتی صفات اور متصوفانہ کمالات کو بیان کیا گیا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے ''یادوں کی برأت'' میں

بعض اہم خاکے تحریر کئے ہیں لیکن اردو کے بیشتر خاکہ نگاری کے فن پر پورے نہیں اترتے۔

بلا تامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں خاکہ نگاری کا تصور سب سے پہلے محمد حسین آزاد کے یہاں ملتا ہے محمد حسین آزاد ایک Sketch writer اور Pen protraiture تھے۔ آزاد کے خاکوں کے نمونے دربار اکبری، نیرنگ خیال اور آبِ حیات میں ملتے ہیں جو نہایت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ ذوق دہلوی کا خاکہ اس کی بہترین مثال ہے۔

اردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش واضح نہیں ہیں اور قدیم ادب میں اس کا کوئی مثبت تصور نہیں ملتا۔ البتہ بیسویں صدی کے اوائل سے اردو میں خاکہ نگاری کا آغاز تصور کیا جاتا ہے۔ ناول، افسانہ اور انشائیہ کی طرح خاکہ نگاری بھی اردو میں مغرب کی دین ہے۔ یہ اردو کی ایک نئی صنف ہے جس کی عمر سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اردو میں بہت جلد خاکہ نگاری نے مقبولیت اور پذیرائی حاصل کر لی۔

دیگر ادبیات کے علاوہ خاکہ نگاری کا تصور یونانی ادب میں بھی موجود تھا۔ جبکہ اردو تذکروں میں جستہ جستہ خاکہ نگاری کے لئے مختلف انگریزی اصطلاحوں مثلاً Sketch, Pen Protrait اور Charter Sketch یعنی مرقع نگاری، خاکہ نگاری اور تصویر کشی کے طور پر مستعمل ہے۔ ہندی میں اسے ''ریکھا چتر'' کہتے ہیں لیکن اردو میں ''خاکہ'' زیادہ مقبول عام ہے۔

دور جدید کے خاکہ نگاروں میں عارف عزیز، شمیم جیراج پوری، منظور عثمانی، صغرا مہدی، نصرت ظہیر، عبدالصمد کے نام قابل ذکر ہیں۔

اختصار خاکہ کا فنی وصف ہے کامیاب خاکہ وہی ہے جس کی ظاہری اور باطنی کیفیات میں شخصیت کا بیان غیر جانبدارانہ ہو اور اس کے منفی و مثبت دونوں پہلوؤں کو معروضی انداز میں پیش کیا گیا ہو۔

☆☆☆

تحریک آزادی کا مطالعہ: اردو نثر کی روشنی میں

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

جنوں کی یہ حکایت خوں چکاں ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے عرصہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس قیامت صغریٰ کے حالات و کوائف بیان کرنے سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور طبیعت پراگندہ ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر بے شمار ادیبوں اور صحافیوں نے قلم اٹھایا ہے اور مورخین نے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ انگریز مورخین اس تحریک کو غدر، بغاوت اور فوجی شورش کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ جنگ ہندوستان کے حریت پسند عوام اور سپاہ نے فرنگیوں کی بربریت کے خلاف لڑی تھی۔ ہندوستان کے عوام اپنے تہذیبی اقدار کا تحفظ چاہتے تھے۔ آزادی کی اس عظیم تحریک میں ملک کے ہندو مسلم اور سکھ رہنماؤں نے یکساں طور پر شرکت کی تھی جسے قومی یک جہتی کی ایک شاندار مثال کہا جاسکتا ہے۔

برطانوی ملک گیری کا جو سلسلہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں شروع ہوا تھا ۱۸۵۷ء میں اودھ کے خاتمہ پر اس کی تکمیل ہوگئی اس موقع پر ہندوستانیوں نے ایک عظیم بغاوت کی شکل میں پلاسی کے قومی سانحے کی صد سالہ برسی کی اس بغاوت کو جسے انگریزوں نے غدر کا مہمل نام دیا تھا۔ بروئے کار لانے میں ہندوستانی اخباروں نے نمایاں حصہ لیا۔

اردو نثر کی روشنی میں جب ہم تحریک آزادی کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات

واضح طور پر پر سامنے آتی ہے کہ تحریک آزادی کے فروغ اور قومی شعور کی بیداری میں اردو نثر نے اہم اور موثر کردار ادا کیا۔ زیر بحث موضوع کے تحت ہم نے ناول، افسانہ، ڈرامہ، طنز و مزاح اور اردو صحافت کو بطور خاص شامل کیا ہے اور انہیں اصناف کی روشنی میں تحریک آزادی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

ایک عرصہ تک انگریز حکام ہندوستان کے عوام پر تشدد کرتے رہے اس مسلسل سفاکانہ رویے سے ہندوستان کے عوام اور سپاہ متنفر ہو چکے تھے ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور انہوں نے انگریز عمل داری کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ۳۱ رمئی انقلاب کی تاریخ طے پائی۔ لیکن میرٹھ کے حریت پسند سپاہیوں سے صبر نہ ہو سکا اور ۱۰ رمئی کو منگل پانڈے نے ایک انگریز افسر پر گولی چلا دی۔ نتیجہ کے طور پر قبل از وقت جنگ شروع ہو گئی۔ اردو اخبارات پہلے ہی سے آزادی کی اس تحریک کو اپنی تحریروں کے ذریعہ پیش کر کے عوام میں قومی بیداری کی لہر پیدا کر چکے تھے۔ عوام کے دلوں میں آزادی کا جوش و ولولہ بڑھتا جا رہا تھا۔

اس تحریک کو فروغ دینے میں جن اخبارات نے نمایاں طور پر حصہ لیا ان میں مولانا محمد باقر کا ''دلی اردو اخبار'' جو ۱۸۳۷ء میں دلی ہی سے جاری ہوا منشی نول کشور کا ''اودھ اخبار'' ۱۸۰۹ء میں نکلنا شروع ہوا۔ جمیل الدین کا ''صادق الاخبار'' حیدر علی کا ''شعلۂ طور'' ۱۸۶۰ء میں کانپور سے نکلنا شروع ہوا۔ سحر سامری'' ۱۸۰۶ء میں جاری ہوا۔ نواب کلب علی خاں کا اخبار ''دبدبۂ سکندری'' ۱۸۶۶ء میں رامپور سے جاری ہوا اس کے علاوہ بھی متعدد اخباروں کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔

''صادق الاخبار'' کے اپریل ۱۸۵۷ء کے شمارہ میں میرٹھ کی ایک خبر اس طرح ہے۔

> ''وہاں کا مختلف حال سنا جاتا ہے نتیجہ سب کا یہ ہے کہ ابھی دمدمہ میں انگریز اور گورے موجود ہیں کچھ سوار سپاہ بریلی کی طرح سے

جو آئے ہیں کالی ندی پر پڑے ہیں اور سب ارادہ غزا پر منعقد ہیں۔''

دہلی اردو ''اخبار'' کے مئی ۱۸۵۷ء کے شمارے میں کانپور کی ایک خبر نقل کی جارہی ہے۔

'' کانپور کا حال بے مثال سب جگہ کے سنا گیا جہاں انگریز پایا جاتا مارا جاتا ہے۔''

''لکھنؤ کی خبریں سنا جاتا ہے کہ لکھنؤ میں انگریزوں کا وہی حال ہوا جو یہاں دیکھا گیا۔''

بلند شہر کی خبریں: بلند شہر میں بھی سنا ہے کہ سپاہ نے انگریزوں کو مار ڈالا جو کوئی قسمت سے بھاگ گیا۔ سو بھاگ گیا باقی سب مارے گئے قید سے جیل خانے کو تمام چھوٹ گئے اور کوٹھیاں انگریزوں کی تباہ و برباد ہوئیں۔

۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کے دلی اردو اخبار کی ایک خبر اس طرح ملتی ہے۔''ابھی تک بھی انگریز روز و شب چھپے چھپائے نکل آتے ہیں۔ اور اپنی سزا کو پہنچائے جاتے ہیں۔''

ہندوستان کے عوام اور سپاہ نے جہاں انگریزوں کو دیکھا قتل کر دیا ملکی گیر سطح پہ جنگ مہینوں اور برسوں تک جاری رہی شہر در شہر قریہ در قریہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن غدر فرو ہو جانے کے بعد برسوں تک انگریزوں کی انتظامی کاروائی کا سلسلہ جاری رہا اور بڑی عبرت ناک سزائیں دی گئیں۔

لیکن جب بیسویں صدی میں سیاسی تحریکوں نے زور پکڑا تو اخبارات نے واضح طور پر ان تحریکوں میں حصہ لیا اس طرح کے اخباروں میں ظفر علی خاں کا ''زمیندار'' (۱۹۰۰) جالب دہلوی کا ہمدم (۱۹۱۴) مولانا محمد علی جوہر کا ہمدرد'' مولانا ابوالکلام آزاد کا ''الہلال اور ''البلاغ لسان الصدق، رام چندر کا اخبار ''غدر'' (۱۹۱۳) لالہ شنکر کا اخبار کانگریس (۱۹۱۹) شامل ہیں۔

اس کے علاوہ بھی اردو اخبارات کی ایک طویل فہرست ہے ان سبھی کا ذکر یہاں ممکن نہیں ہے۔

ان اخباروں کے مدیروں نے اپنی گراں قدر تحریروں کے ذریعہ حریت پسند عوام میں ایک نئی روح پھونکی ان میں قومی شعور کا جذبہ بیدار کیا اور آزادی کی تحریکوں کو ملک گیر سطح پر پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اخبارات کے مدیروں کو پھانسیاں دی گئیں۔ ان کے مطابع اور ضمانتیں ضبط کر لی گئیں۔ ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے لیکن وہ آخر تک قلم کی تلوار سے جنگ کرتے رہے۔

صحافت کے علاوہ اردو ناولوں میں بھی قومی بیداری کے عناصر واضح طور پر مل جاتے ہیں۔ ناول کے ذیل میں نذیر احمد کا ناول ابن الوقت اپنے دور کے معاشرتی اور سیاسی حالات کی عکاسی کرتا ہے اس ناول میں فصل دوم سے فصل ششم تک جنگ آزادی کے واقعات اور اس کے عواقب کا بیان نذیر احمد کے عینی مشاہدے پر مبنی ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں قومی نظریات و رجحانات میں تبدیلیاں پیدا ہوگئیں بہت سی نئی تحریکیں ابھر کر سامنے آئیں مثلاً مسلم لیگ کا قیام، تقسیم بنگال، ہوم رول، خلافت تحریک وغیرہ۔ یہی وہ زمانہ تھا جب پریم چند نے اردو ناول اور اردو افسانے کے میدان میں قدم رکھا۔ پریم چند کا تخلیقی سفر ۱۹۰۷ء سے شروع ہوکر ۱۹۳۶ء پر ختم ہوجاتا ہے۔ اس مدت میں پریم چند نے کم وبیش تین سو کہانیاں اور بارہ ناول تخلیق کیے۔ پریم چند کا زمانہ سیاسی اعتبار سے بڑا ہی ہیجان انگیز تھا۔ عوام میں پھیلی ہوئی سراسیمگی، پہلی جنگ عظیم کا ختم ہونا برطانوی اقتدار کے خلاف عوام میں بیزاری محنت کش عوام کی زبوں حالی اور متوسط طبقہ کی بیداری، پریم چند نے ان تمام مسائل کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ پریم چند کے اس طرح کے ناولوں میں گوشۂ عافیت، میدانِ عمل اور چوگان ہستی قابل ذکر ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے گئے ناولوں میں آزادی کی تحریک کو بالخصوص جگہ دی گئی۔ ان ناولوں میں سجاد ظہیر کا ناول

لندن کی ایک رات، عصمت چغتائی کا ٹیڑھی لکیر، کرشن چندر کا شکست، عزیز احمد کا ناول گریز نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

پریم چند کے ابتدائی افسانوں کا مقصد یہ تھا کہ ان کے ذریعہ قوم میں وطن کی محبت اور محبت میں سب کچھ نثار کر دینے کا جذبہ بیدار کیا جائے۔

پریم چند کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سوزِ وطن'' ہے اس مجموعہ میں شامل افسانوں میں دنیا کا سب سے انمول رتن، شمع مخمور، یہی میرا وطن ہے۔ صلہ ماتم اور عشق دنیا اور حب وطن ہے، ان میں صلہ ماتم کے علاوہ تمام افسانے حب الوطنی کے موضوع پر لکھے گئے۔ ان افسانوں کے علاوہ پریم چند کے افسانوں میں ڈامل کا قیدی، آخری تحفہ، جیل سہاگ کی ساڑی، جلوس، ہولی کا اپہار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں آزادی کی تحریک اور ترک موالات کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ سیاسی تحریکوں سے متاثر ہونے اور سرکاری ملازمتوں سے عوام کے مستعفی ہونے کے واقعات لال فیتہ میں ملتے ہیں یہی وہ زمانہ تھا جب افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' منظر عام پر آیا اس وقت ملک ایک خاص سیاسی بحران میں مبتلا تھا۔ ملک میں آزادی کے ترانے گائے جارہے تھے۔ ہندوستان کے سیاسی اور معاشی حالات اور برطانوی ادیبوں کے سخت رویوں نے ادیبوں اور تخلیق کاروں کے احساس کو جھنجھوڑا۔ ترقی پسند تحریک کے روح رواں سجاد ظہیر نے اپنی کتاب ''روشنائی'' میں برطانوی اقتدار کے معاندانہ رویوں کے خلاف لکھا ہے۔

> ''ہم برطانوی سامراج کے اس رویے کی سخت مذمت کرتے ہیں کہ وہ ان نازک حالات میں ہمارے وطن کو آزادی دینے کے لئے تیار نہیں۔''

پریم چند کے بعد افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، احمد علی، منٹو، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، سہیل عظیم آبادی اور اس سے ذرا آگے

بڑھ کر احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، خواجہ احمد عباس بلونت سنگھ، حسن عسکری، ممتاز مفتی، اختر اورینوی، اپندر ناتھ اشک، ابراہیم جلیس وغیرہ کے نام سامنے آتے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں آزادی کی سلگتی ہوئی چنگاریاں محسوس کی جاسکتی ہے۔

احمد علی کا افسانہ ہماری گلی، بیدی کا گرم کوٹ، کرشن چندر کا افسانہ دو فرلانگ لمبی سڑک، منٹو کا افسانہ نیا قانون، عصمت چغتائی کا افسانہ دوزخی، حیات اللہ انصاری کا افسانہ آخری کوشش ابراہیم جلیس کے افسانے چالیس کروکڑ بھکاری، رذیل، زرد چہرے، تکونا دیس، ہندوستان چھوڑو، اونچی ایڑھی کی گرگابی، اسی نوع کے خیال کی ترجمانی کرتے ہیں۔

۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں منعقدہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے موقع پر پریم چند نے خطبۂ صدارت میں کہا تھا:

> ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو آزادی کا جذبہ ہو حسن کا جوہر ہو تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت ہنگامہ، اور بے چینی پیدا کردے، سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہے۔''

پریم چند کے بیشتر کرداروں کی ایک مشترک خصوصیت یہی نظر آتی ہے کہ وہ مثالی ہوتے ہیں۔ وطن پرستی، حوصلہ، ہمت اور ایثار ان کا لازمی عنصر ہوتا ہے۔

منٹو نے ایک خاص دور کے سیاسی حالات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ نیا قانون، شرابی، تماشہ، ماتمی جلسہ، دیوانہ شاعر، سوراج کے لیے، افسانے بنیادی طور پر سیاسی احساس پر مبنی ہیں، ۱۹۱۹ء کے مارشل لا کے ہنگاموں کو پیش کرتا ہے اس میں منٹو نے تحریک عدم تعاون کی جدوجہد اور اس کے نتیجہ میں افراد کی گرفتاری اور ان کی رہائی کے بعد کی زندگی کے سیاسی انداز کو پیش کیا ہے۔ ان کرداروں کے دلوں میں پیدا ہونے والی آزادی کی خواہش جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے:

''آہ آزادی.....خدا معلوم اس کا ذائقہ کس قدر لذیذ ہوگا ان آزاد لوگوں کے حالات پڑھتا ہوں تو مجھے ایک افسانہ سا معلوم ہوتے ہیں۔ میں اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہم بھی کبھی آزاد ہوں گے؟''

منٹو کا افسانہ نیا قانون کا مرکزی کردار منگلو کوچوان ہے جو سیاسی طور پر بیدار نظر آتا ہے اور اسے غلام قوم کے فرد ہونے پر سبکی ہوتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر وہ برٹش گورنمنٹ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتا ہے۔ اسے انگریزوں سے سخت نفرت ہو جاتی ہے۔ اور وہ شدت سے ان کی مخالفت کرنے لگتا ہے نیا قانون نافذ ہونے والا ہے۔ وہ احتجاج کرتا ہے اس جرم کی پاداش میں اسے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔

ابراہیم جلیس نے بھی اپنے بعض افسانوں میں سیاست کو جگہ دی انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ غیر ملکی سیاسی اقتدار کے خلاف نعرۂ حق بلند کیا اور معاشی زبوں حالی کا ذمہ دار انگریزوں کو ٹھہرایا۔ ابراہیم جلیس کے افسانوں میں چالس کروڑ بھکاری، رذیل، زرد چہرے، تکونا دیش، ہندوستان چھوڑو، اونچی ایڑھی کی گرگابی، ہمیں امن نہیں چاہیے، ایسے متعدد افسانے ملتے ہیں جو اپنے عہد کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ ناکام ہونے کے بعد قومی اور سیاسی بیداری کے دور میں کئی ڈرامہ نگاروں نے سیاسی موضوعات اور مسائل پر ڈرامے تخلیق کئے۔ یہ ڈرامے عصری سیاسی تقاضوں کے نتیجے میں معرض وجود میں آئے ان میں سیاسی جذبات و احساس اور شعور عام نظر آتا ہے ۱۸۵۷ء کے بعد جن ڈرامہ نگاروں نے مقبولیت اور شہرت حاصل کی ان میں آرام رونق بنارسی، حافظ عبداللہ حسینی ''میاں ظریف'' طالب بنارسی اور احسن لکھنوی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں ان ڈرامہ نگاروں نے کھل کر برطانوی مظالم، سیاسی جبر و استبداد، اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور فریب کاریوں کو منظر عام

پر لانے کی کوشش کی۔ اور چند ڈراموں میں آزادی کی اہمیت حصول آزادی کی ترغیب اور برطانوی حکومت سے نجات جیسے موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

اردو میں سیاسی موضوع پر پہلا ڈرامہ فرنگی اور ہندوستانی طرز حکومت'' تھا جو ۱۸۵۷ء میں بمبئی میں اسٹیج پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد متعدد ڈرامے تخلیق کئے گئے۔ ان میں ظفر علی خاں کا ڈارامہ جنگ روس و جاپان اور اصغر علی نظامی کا ڈرامہ قومی دلیر، عبداللطیف شاہ کا ڈرامہ ''تمہارا گھر''، شمس لکھنوی کے ڈراموں میں ''مادر وطن'' اور حب وطن خاص طور پر سامنے آتے ہیں۔ محمد دین تاثیر کا لیلائے وطن، عاجز کانپوری کا ''پیغام حق'' محی الدین عزم کا ڈرامہ ''دیش کی پکار'' اظہر دہلوی کا ڈرامہ بیداری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان ڈراموں میں حب الوطنی کا جذبہ اور لگن پائی جاتی ہے۔ ڈرامہ بیداری کا ایک اقتباس ذیل میں نقل کیا گیا ہے۔

> ''امرت.....جلیانوالہ باغ کی زمین لالہ زار بنادی گئی۔ بے گناہ اور نہتے ہندوستانیوں کو مشین گنوں کا نشانہ بنادیا گیا۔ مسلمان بھائیوں کی خلافت پارہ پارہ کردی گئی اور ان کی فریاد مطلق نہیں سنی گئی۔''

اردو میں طنزیہ و مزاحیہ ادب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کو بیشتر حضرات صنف تصور کرتے ہیں لیکن یہ صنف ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ شاعری یا نثر میں ایک پہلو کی حیثیت رکھتا ہے۔ البتہ تحریف یعنی پروڈی کو مستقل ایک صنف کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ طنز و مزاح میں تحریک آزادی اور قومی شعور کی بیداری کے سلسلے میں متعدد تحریریں ملتی ہیں اس میں بڑا حصہ ''اودھ پنچ'' کا ہے جو ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے منشی سجاد حسین کی ادارت میں یہ پہلا اخبار تھا، اس کے قلم کاروں میں رتن ناتھ سرشار، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ ستم ظریفی، نواب سید محمد آزاد، منشی جوالہ پرساد برق، احمد علی شوق اور اکبر حسین کے نام سامنے آتے ہیں۔

منشی سجاد حسین نے ملک کی آزادی اور نیشن کے تحفظ کے لیے اودھ پنچ میں متعدد مضامین قلم بند کیے۔ سجاد حسین نیشنلٹ ذہن رکھتے تھے وہ آخر میں انڈین نیشنل کانگریس کے حامی رہے۔ سجاد حسین کے مضامین میں انڈے بچے والی چیل چلہاڑ، نیچر کا مارشل لا، مٹی خراب خلق میں مہر و وفا کی ہے، ہڈیوں پر میرلڑتے ہیں، کہ ہوں وہ بھی بے قرار، بے مار کی توبہ، پروفیسر اودھ پنچ کے پولیٹیکل اقلیدس، ٹیکس کی دم، ابر کا مل اور سرکار انگلشیہ، منھ لگائی ڈومنی کائے تال بے تال، یہ مبارک جنگ کا چندہ ہے وغیرہ مضامین میں مصنف نے طنز و مزاح کے پیرایے میں حکومت کی کوتاہیوں اور بد عنوانیوں کا پردہ فاش کیا ہے۔

اودھ پنچ کے قلم کاروں میں جوالا پرساد برق بھی شامل تھے۔ برق ایک اعلیٰ پائے کے مزاح نگار تھے ان کا مضمون ''البرٹ بل'' ہے برق کے علاوہ تربھون ناتھ، مہجر اور احمد علی کٹھمنڈی کی تحریری ملک کے اساسی مسائل پر لکھی گئیں۔

اودھ پنچ کے عبوری دور کے ظرافت نگاروں میں نیاز فتح پوری، مہدی الافادی، محفوظ علی بدایونی۔ ابوالکلام آزاد، سلطان حیدر جوش، سجاد انصاری، مولانا محمد علی جوہر، قاضی عبدالغفار، ملا رموزی کے نام شامل ہیں۔

محفوظ علی کا مضمون انجمن تجاہل عامیانہ کا غیر معمولی جلسہ، کاروائی جلسہ بلبلان اسیر کی رہائی ابوالکلام آزاد کے اخبار الہلال میں شذرہ افکار و حوادث، مولانا محمد علی جوہر کا مضمون سائمن کمیشن عظمت اللہ خاں کا مضمون گڑیہ خانہ، ایکٹریس، ڈیڑھ اینٹ قابل ذکر ہیں۔ ان قلم کاروں نے اپنی ظریفانہ تحریروں کے ذریعہ، مغربی سیاست اور برطانوی حکومت کی مخالفت کی اور اس دور کی سیاسی ہلچل اور مسائل کو اپنی تحریروں میں پیش کیا۔

☆☆☆

جلیانوالہ باغ پر اردو اداریے

ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا آغاز جنگ پلاسی اور میسور کی جنگوں ہی سے ہوگیا تھا۔ نواب سراج الدولہ کے سفاکانہ قتل کے بعد ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی چنگاریاں برابر سلگتی رہیں۔ جو ۱۸۵۷ء کی جنگ کی شکل میں رونما ہوئیں۔ چربی والے کارتوس تو صرف ایک بہانہ بن گئے۔ ۱۸۵۷ء میں اس تحریک نے شدت اختیار کرلی ۳۱ر مئی انقلاب کی تاریخ طے پائی تھی لیکن میرٹھ کی ہندوستانی فوج سے صبر نہ ہوسکا اور منگل پانڈے نے دس مئی کو ایک انگریز افسر پر گولی چلادی اور جنگ قبل از وقت شروع ہوگئی۔

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی جو ۱۸۵۷ء کی شکل میں رونما ہوئی جو کسی فوری منصوبے کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس کی تیاریوں کا سلسلہ تو جنگ پلاسی سے شروع ہوگیا تھا۔

اس جنگ میں ہندوستان کے سب ہی مذاہب اور اقوام نے کاندھے سے کاندھا ملا کر انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا۔ جس کو ہندو مسلم اور سکھ اتحاد کی ایک خوبصورت اور شاندار مثال کہا جاسکتا ہے جنگ ناکام ہوئی اور ہندوستانیوں کو بری طرح کچل دیا گیا۔ جنگ کی ناکامی کے بعد انگریزوں کی انتقامی کاروائی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جگہ جگہ چوراہوں پر پھانسی گاہیں بنوائی گئیں۔ اور خصوصاً مسلمانوں پر سخت مظالم ڈھائے گئے جس کے ذکر سے بھی جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ۱۸۸۵ء انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ اس تنظیم کو ایک ریٹائرڈ انگریز گورنر جنرل A.O. Hume نے قایم کیا تھا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں متعدد سیاسی تحریکوں نے جنم لیا۔ آزادی کی تحریکوں میں شدت اور ہمہ گیری پیدا ہوگئی۔ مسلم لیگ، ہندو مہا سبھا کا قیام، ہوم رول لیگ، خلافت تحریک وہابی تحریک، ریشمی رومال تحریک، آزاد ہند فوج کا قیام بھارت چھوڑو تحریک سول نافرمانی ترک موالات اور عدم تعاون وغیرہ تحریکیں زوروں پر تھیں۔

پہلی جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی انگریز یہ بخوبی جانتے تھے کہ ہندوستان کے عوام اپنے جائز حقوق کی مانگ کریں گے لہٰذا انگریزوں نے اس کے انسداد کے لئے رولٹ ایکٹ کے نام سے ایک بل پاس کیا جس کی رو سے ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا اور انہیں سخت ترین سزائیں دی گئیں۔ اس سلسلے میں ہندوستانی رہنماؤں نے برطانوی سرکار کی سفاکانہ پالیسی کے خلاف ۱۲ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ امرتسر میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ جلیانوالہ باغ عمارتوں سے محصور ایک کھلا ہوا احاطہ تھا جس میں ایک ایسا تنگ راستہ تھا جہاں سے ایک مسلح کار بھی نہیں گذر سکتی تھی اس احاطہ میں مختلف لوگوں کے اندازے کے مطابق تقریباً پچاس ہزار لوگ جمع تھے۔ لوگ پرامن طریقے سے اپنے رہنماؤں کی تقریریں سن رہے تھے۔ جنرل ڈائر اور اس کے ساتھ کئی ہزار فوجی صدر دروازے سے داخل ہوئے۔ جنرل ڈائر نے فوراً اپنی فوج کی صفیں باندھ کر باغ کا محاصرہ کرلیا۔ جنرل ڈائر کے حکم پر انگریز سپاہیوں نے اندھا دھند گولیاں چلائیں۔ ہزاروں ہندو مسلمان سکھ اور عیسائی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے ہزاروں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوگئے۔ جنرل ڈائر کے بہیمانہ رویے نے ہندوستانیوں کے دلوں میں انتقام کا جذبہ پیدا کردیا۔

انڈین نیشنل کانگریس کی پنجاب سب کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق بے قصور اور نہتے لوگوں پر ایک سوچا سمجھا اور وحشیانہ عمل تھا اور حالیہ برٹش حکومت کی تاریخ میں اپنی سنگ دلی میں لافانی تھا۔

اس حادثہ میں تقریبا دو ہزار ہندوستانی ہلاک اور کئی ہزار زخمی ہوئے۔

جلیانوالہ باغ کے خونچکاں حادثہ کے سلسلے میں ۱۹۲۰ء میں ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ منظر عام پر آئی۔ یہ رپورٹ سرتاسر ہندوستانی عوام کے خلاف تھی اس رپورٹ کو پڑھ کر عوام میں اشتعال پیدا ہو گیا۔

جلیانوالہ باغ کے خونچکاں حادثہ کو ہندوستان کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس عظیم حادثہ کا ذکر اردو اخبارات نے متعدد بار اپنے اداریوں میں کیا ہے۔ اداریے اپنے عہد کی تاریخی، سیاسی، ادبی، تہذیبی، اور ثقافتی تاریخ کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ جلیا نوالہ باغ کے حادثہ کے کئی برس بعد تک اردو اخبارات اپنے اداریوں میں مسلسل لکھتے رہے اور غم واندوہ کا اظہار کرتے رہے۔ جن اخباروں کے مدیروں نے اپنے اداریوں میں جلیانوالہ باغ اور آزادی کی تحریکات کے بارے میں تحریریں شائع کیں ان میں وطن اخبار، ایڈیٹر انشاء اللہ یہ اخبار لاہور سے جاری ہوا۔'' زمانہ'' کانپور، ترقی'' لاہور فخر عالم'' مرادآباد وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

اس دور کا ایک اہم اخبار'' زمیندار'' تھا یہ اخبار ۱۹۰۹ء میں لاہور سے جاری ہوا جسے مولانا سراج الدین نے جاری کیا تھا۔ ان کے فرزند مولانا ظفر علی خاں نے اس اخبار کو جاری رکھا۔'' زمیندار'' میں اس دور کے سیاسی اداریے بلند آہنگ اور خطیبانہ انداز کے غماز ہیں اس اخبار نے عوام کے دلوں میں غیر ملکی حکومت کا خوف اور صداقت پر رہ کر اپنی بات کہنے کا درس دیا۔ عوام میں اپنے اداریوں کے ذریعہ سیاسی بیداری پیدا کی۔

مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں کے اداریے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان مدیروں نے سیاسی تحریکوں کے علاوہ جلیا نوالہ باغ کے حادثہ پر متعدد اداریے لکھے جس کا ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

> '' جلیانوالہ باغ کی زمین لالہ زار بنادی گئی ہے بے گناہ اور نہتے ہندوستانیوں کو مشین گنوں کا نشانہ بنادیا گیا۔ مسلمان بھائیوں کی

خلافت پارہ پارہ کردی گئی اوران کی فریاد مطلق نہیں سنی گئی۔''

تحریکِ آزادی کے عظیم مجاہد، سیاست دان، اعلیٰ پائے کے تخلیق کار اور معروف صحافی سید فضل الحسن حسرت موہانی کی ادارت میں رسالہ اردو معلیٰ جولائی ۱۹۰۳ء سے نکلنا شروع ہوا۔اس رسالے میں جلیانوالہ باغ پر متعدد اداریے شائع ہوتے تھے۔اس دور کے اردو اخباروں میں ''ہندوستانی'' بھی قابل ذکر ہے۔''ہندوستانی'' ۲۶/اگست ۱۹۰۴ء کو لاہور سے ہفتہ وار جاری ہوا۔یہ اخبار انگریزوں کے سخت خلاف تھا۔اسی طرح کا ایک اخبار آزاد ''دوار کا'' تھا اخبار سے لاہور سے جولائی (۱۹۰۷ء) میں جاری ہوا، لاہور سے جاری ہوا۔اس کے مدیر بشن نارائن آزاد تھے۔''ہند'' کے ایڈیٹر درارکا پرشاد افق لکھنوی تھے یہ اخبار لکھنؤ سے جاری کیا گیا تھا'' آفتاب'' ہفتہ وار کے ایڈیٹر حیدر رضا دہلوی تھے''سوراجیہ'' ۱۹۰۷ء میں الہ آباد سے نکلنا شروع ہوا۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں بعض اہم اخباروں کا اجراء عمل میں آیا اس دور کے صحافیوں میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مولانا آزاد ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے وہ ایک صاحب طرز ادیب، محقق اور سیاست داں تھے۔صحافت میں ابوالکلام آزاد کا ایک اہم کارنامہ ''الہلال'' ہے۔ اس کا اجراء ۱۳/جولائی ۱۹۱۲ء کو عمل میں آیا۔بعض مجبوریوں کی بنا پر'' الہلال'' بند ہوگیا۔اس کے بعد مولانا نے''البلاغ'' جاری کیا۔

مولانا کی ادارت میں'' الہلال'' نے ہندوستان کے عوام کو انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی ہی دعوت نہیں دی بلکہ انہیں یہ بھی بتایا کہ انگریز سامراج کے خلاف ان کی جدوجہد تمام آزاد پسند اقوام کی جدوجہد کا ایک جزء ہے۔اس طرح الہلال نے ہندوستان کے مجاہدوں کے ذہنی افق کو وسعت بخشی اوران کے عزائم اور ارادوں کو پختگی عطا کی۔

تحریک آزادی کی تاریخ میں مولانا محمد علی جوہرؔ کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے

وہ سچے مجاہد آزادی اور محبّ وطن تھے تحریکِ آزادی کی تبلیغ کے لئے انہوں نے اخبار'' ہمدرد'' جاری کیا تھا۔

عتیق صدیقی نے اپنی کتاب'' اردو اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں'' لکھا ہے کہ:

''ہندوستانی اخبار نویسی کا اگر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستانی اخبار نویسی کا مزاج ابتداء ہی سے باغیانہ تھا۔''

جلیانوالہ باغ کے سانحہ کے کئی برس بعد تک اخبارات اپنے اداریوں میں اس کی حکایت خونچکاں قلم بند کرتے رہے۔

اخبارات کے مدیروں پر مظالم توڑے گئے ان کے مطابع ضبط کر لیے گئے۔انہیں قید با مشقت کی سزائیں دی گئیں۔لیکن اردو اخبارات کے اداریوں نے عوام میں سیاسی بیداری پیدا کر کے حصولِ آزادی کی راہیں ہموار کر دیں۔

☆☆☆

گاندھی جی: ایک مصلح تعلیم

سرزمین کاٹھیا واڑ تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت اور قدر و قیمت کی حامل ہے۔ یہ وہی مردم خیز زمین ہے جہاں کی خاک سے ایک ایسے سپوت نے جنم لیا جس نے ہندوستان کی قسمت کو بدل ڈالا اس سپوت کو ہم آج بھی ''باپو'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

گاندھی جی ایک عظیم انسان تھے۔ان کی شخصیت میں بے شمار خوبیاں پوشیدہ تھیں ان کا ذہن ایک دانشور کا ذہن تھا ان کا مزاج ایک مفکر کا مزاج تھا ان کا دل ایک قلندر کا دل تھا۔ان کی سوچ ایک ماہر تعلیم کی سوچ تھی۔ان کی زبان ایک مقرر کی زبان تھی۔ان کا قلم ایک ادیب کا قلم تھا گویا وہ ایک مکمل ادارہ تھے۔گاندھی جی کی زندگی سراپا عمل تھی انہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں کامیاب تجربے کیے لیکن وہ تعلیم کے میدان میں بطور خاص دلچسپی رکھتے تھے ان کا خیال تھا کہ سچی دماغی تعلیم کی ابتدا جسمانی تعلیم و تربیت سے ہونی چاہیے۔گاندھی جی نے سچی تعلیم اس تعلیم کو کہا ہے جس میں ذہن، جسم اور دل تینوں کی تربیت کا خیال رکھا جائے اور جو لوگوں کے دلوں میں خدمت کا جذبہ پیدا کرے۔گاندھی جی نے جس طرح کی تعلیم پر زور دیا اور ان میں خود اعتمادی کی تعلیم، ادبی تعلیم، تعلیم میں سائنس کا استعمال، خانگی تعلیم، تعلیم دیسی زبان کے ذریعہ اور سیرت کی تشکیل شامل ہیں۔

قومی تعلیم کے سلسلے میں گاندھی جی کا نقطۂ نظر دوسرے ماہرین تعلیم سے مختلف تھا ان کا خیال تھا کہ تعلیم مادری زبان میں ہونی چاہیے۔جو بچے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں ان میں اور ان کے گھر کے ماحول میں مطابقت ہونا ضروری

ہے۔ تعلیم مفت ہو اور لائق اساتذہ کا انتخاب کیا جائے۔ گاندھی جی نے Education Vocatinal پر بھی زور دیا۔ مثال کے طور پر کھادی کو اپنانے کا مقصد صرف کپڑا پہننے تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ جو اشیاء جس علاقہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان اشیاء کا سامان ہاتھ سے تیار کرائیں اور ان کا استعمال اپنی روزمرہ کی زندگی میں کیا جائے۔

گاندھی جی نے اپنے تعلیمی خیالات اپنی کتاب ''ستیہ گرہ آشرم کی تاریخ'' میں تحریر کیے ہیں۔ یہ کتاب گجراتی زبان میں لکھی گئی تھی۔ ان خیالات کو بالترتیب اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

☆ چھوٹے بچوں کی آٹھ سال تک کی عمر تک مخلوط تعلیم ہونا چاہیے۔

☆ ان کی تعلیم کسی ماہر تعلیم کی زیر نگرانی ہو جو بالخصوص ہاتھ کے کام پر مشتمل ہو۔

☆ جب بچے کو مختلف چیزوں کی پہچان ہو جائے تو اسے عام معلومات سے روشناس کرایا جائے۔

☆ بچہ کو علم ہندسہ کی شکلیں بھی سکھائی جائیں۔ اس کے بعد حروف تہجی سکھائی جائیں۔

☆ بچے کو کوئی چیز زبردستی نہیں سکھانا چاہیے کسی چیز کو سکھاتے وقت اس کی دلچسپی کا خیال رکھا جائے۔

☆ تعلیم بچے کو کھیل کی طرح لگے۔ کیونکہ کھیل نہیں تعلیم کا ایک لازمی جز ہے۔

☆ تعلیم مادری زبان کے ذریعہ ہونا چاہیے۔

☆ تعلیمی اداروں کے لیے بلند و بالا عمارتوں کی ضرورت نہیں ہے۔

☆ انگریزی کئی زبانوں میں سے ایک زبان کے طور پر پڑھائی جائے۔

☆ عورتوں کو بھی تعلیم دینا چاہیے اور انہیں بھی وہی سہولتیں فراہم ہوں جو مردوں کو ہیں۔

☆ بالغوں کی تعلیم کے لیے شبینہ کلاسوں کا انتظام ہونا چاہیے۔ اگر وہ چاہیں تو انہیں پڑھنا لکھنا سکھانے کا بھی معقول انتظام ہونا چاہیے۔

گاندھی جی نے بنیادی تعلیم پر بطور خاص زور دیا۔ ان کے تعلیمی نظریات میں بڑی وسعت تھی۔ لیکن رسم الخط کے بارے میں گاندھی جی کی پالیسی بڑی معروضی رہی۔ انہیں ہندوستانی زبانیں سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ان کا خیال تھا کہ تمام ہندوستانی زبانوں کا رسم خط دیوناگری میں ہونا چاہیے جس سے ہندوستان کی علاقائی زبانیں ایک دوسرے کے قریب آسکیں اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ پہلے تو عوام باہمی طور پر ایک دوسرے کی زبانوں کے الفاظ سیکھیں گے اور آہستہ آہستہ ان لفظوں کے معنی بھی جان لیں گے۔ اس طرح تمام ہندوستانی زبانوں کا رسم خط دیوناگری رہتے ہوئے بھی سب لوگ ایک دوسرے کی علاقائی زبانوں سے واقف ہو جائیں گے۔

گاندھی جی کو ہندوستانی زبانوں سے بڑا لگاؤ تھا وہ اردو زبان میں بھی خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

> ''انڈین یونین کے تمام مسلمان باشندوں کے ایک چوتھائی یوپی میں رہتے ہیں وہاں سر تیج بہادر کی طرح بہت سے ہندو ایسے ہیں جو اردو کے عالم ہیں کیا ان کو اردو رسم الخط فراموش کر دینا پڑے گا۔ مناسب تو دونوں رسم خط کو اختیار کرنا ہوتا اور دونوں میں سے ہر ایک کو سرکاری معاملات میں اختیار کیا جاتا اس سے دونوں رسم الخط کا سیکھنا ضروری ہوتا تب زبان خود اپنی فکر آپ کرتی اور صوبے کی زبان ہندوستانی بن جاتی دونوں رسم الخط کی واقفیت بیکار نہ جاتی ہمیں مسلمانوں کے ساتھ مساوی شہریوں کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ مساوی برتاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اردو رسم خط کا بھی احترام کیا جائے۔''

ہندی اور اردو:

گاندھی جی نے کہا تھا کہ میں ہندی اس زبان کو کہتا ہوں جسے شمالی ہند میں ہندو اور مسلمان بولتے ہیں اور جو یا تو دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے یا اردو رسم الخط میں بعض لوگوں کو میری اس تعریف پر اعتراض ہے وہ کہتے ہیں کہ ہندی اور اردو دو مختلف زبانیں ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ ہندو مسلمان دونوں شمالی ہند میں ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ جو فرق ہے وہ صرف تعلیم یافتہ لوگوں کا پیدا کیا ہوا۔ شمالی ہند میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں، وہ بنیادی طور پر ایک ہی چیز ہے اسے اردو رسم الخط میں لکھیں تو اردو کہہ لیجئے اور ہندی رسم الخط میں لکھیں تو اسے ہندی کہہ لیجئے۔

گاندھی جی کو زبانیں سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ کم وبیش پانچ چھ زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ اور گیارہ زبانوں میں دستخط کر سکتے تھے مہاتما گاندھی دنیا کی عظیم شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ ہندوستان کی ادبی، سیاسی، تاریخی، ثقافتی اور تعلیمی و لسانی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کی قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا ہندوستانی گیارہ زبانوں میں گاندھی جی کے دستخط کا عکس ڈیسائی کلکشن میں موجود ہے۔

☆☆☆

خواجہ غلام السیدین
بحیثیت ماہر تعلیم

ہندوستان کی ریاستوں میں ہریانہ ایک ایسا مردم خیز خطہ ہے جہاں بے شمار ادیب شاعر، فن کار، سیاست داں، اور صوفیائے کرام جنم لیتے رہے ہیں۔ اسی سرزمین سے وحید الدین سلیم پانی پتی، مشہور صوفی بزرگ بوعلی شاہ قلندر، خواجہ الطاف حسین حالؔی، خواجہ احمد عباس، خواجہ غلام الثقلین، خواجہ غلام الحسنین اور غلام السبطین ایسی نادر نایاب شخصیتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے اپنے علم کی روشنی سے دنیائے ادب کو منور کیا۔ یہ وہی تاریخی سرزمین ہے جہاں سلطنت مغلیہ کے اولین شہنشاہ ظہیر محمد بابر نے ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی سے پانی پت میں معرکہ کیا تھا۔

اسی سرزمین ذہانت آفریں پر خواجہ غلام السیدین ایسی عظیم المرتبت شخصیت نے ۱۶/اکتوبر ۱۹۰۴ء کو جنم لیا۔ ان کی والدہ مشتاق بیگم ایک ذہین اور صالح خاتون تھیں۔ والدین کی تربیت نے سیدین کی شخصیت میں چار چاند لگا دئے۔

غلام السیدین بیک وقت ماہر تعلیم، شعلہ نوا خطیب (ORATOR) اور اعلیٰ پائے کے ادیب تھے۔ ذکاوت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کا مزاج ایک فلسفی کا مزاج تھا، ان کی اصابتِ فکر ایک عالم کی فکر تھی، علم و فضل میں ان کے خاندان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

خانوادۂ حالی کے اس ذہین فرزند نے اپنے خاندان کی علمی وجاہت اور تعلیمی اقدار کو آگے بڑھانے میں ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ الطاف حسین حالؔی ان کے پرنانا تھے۔ خواجہ سجاد حسین جو علی گڑھ یونیورسٹی کے پہلے گریجویٹ تھے ان کے نانا تھے۔

سیدین کے والد غلام الثقلین علی گڑھ کے تربیت یافتہ ایک قدآور شخصیت کے مالک تھے، اقدار ۴۲ سال کی عمر میں وفات ہوئی۔

سیدین کو اپنے علمی اقدار پر فخر تھا۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں اس کا بھی ذکر کیا ہے۔

> ''سب سے اہم چیز جس کے لئے میں اپنے خدا کا شکر گذار ہوں یہ ہے کہ اس نے مجھے ایک ایسے خاندان میں پیدا کیا جس سے بہتر میں خود انتخاب نہیں کرسکتا۔ یہ بات فخر کے ساتھ نہیں بلکہ انکسار کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ یہ نعمت مجھے بغیر کسی استحقاق کے ملی۔''

غلام السیدین کی ابتدائی تعلیم پانی پت کے مقامی اسکولوں میں ہوئی۔ میٹرک کا امتحان حالی مسلم ہائی اسکول سے پاس کرنے کے بعد وہ علی گڑھ چلے آئے اور وہاں سے بی اے فرسٹ پوزیشن میں مکمل کیا۔ ٹینس (Tennis) سے انہیں گہری دلچسپی تھی اور خطابت سے انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ وہ اسکول اور کالج کی سطح پر بھی تقریری مقابلوں میں حصہ لیتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں اپنے اجداد کی طرح انہوں نے وہاں کی علمی وادبی زندگی میں نمایاں حصہ لیا۔ اس زمانے میں اتر پردیش گورنمنٹ کی طرف سے ہندوستان سے باہر جانے والے طلبہ کے لیے چند وظائف کا اعلان ہوا۔ اس انٹرویو میں سیدین کا بھی سلیکشن ہوگیا۔ سیدین لیڈز یونیورسٹی میں جانے کے لیے انگلستان روانہ ہوگئے۔ ڈپلوما میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد سیدین نے اس یونیورسٹی سے ماسٹر آف ایجوکیشن .M. ED کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے یورپ کے مختلف ممالک کے بھی سفر کئے۔ جرمنی کے سفر کے دوران انہیں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر مجیب سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔

ہندوستان سے باہر سیدین نے اپنی تقریروں اور صلاحیتوں سے بڑی مقبولیت

حاصل کی لیکن انہیں اپنے وطن کی سرزمین سے بے پایاں محبت اور عقیدت تھی۔ وہ پنڈت جواہر لال نہرو، اور گاندھی جی کے تعلیمی افکار ونظریات سے بہت متاثر رہے۔ سیدین کو اپنی مادر درس گاہ علی گڑھ یونیورسٹی سے بے حد لگاؤ تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ علی گڑھ واپس جائیں۔ اسی زمانے میں آفتاب احمد خاں وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ٹریننگ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے سیدین کی خدمات حاصل کرنا چاہیں۔ سیدین نے اس عہدے کو بخوشی قبول کرلیا۔ اس زمانے میں علی گڑھ کے ٹریننگ کالج کی حالت بہت زبوں تھی، اور آفتاب احمد خاں ٹریننگ کی اصلاح کے لیے سیدین کی ضرورت محسوس کررہے تھے۔

غلام السیدین کی ملازمت کا بیشتر حصہ ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر کے زمانے میں گذرا۔ لیکن جب راس مسعود نے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالا تو انہوں نے ٹریننگ کالج کے لیے لیڈز یونیورسٹی یا لندن یونیورسٹی سے کسی ماہر تعلیم کو بلانے کی خواہش کی۔ غالباً انہیں سیدین کی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں تھا۔ لیڈز یونیورسٹی سے جواب ملا کہ آپ کے یہاں سیدین کی جیسے ماہر تعلیم موجود ہیں آپ ان کی خدمات حاصل کیوں نہیں کرتے۔ ۱۹۳۱ میں سیدین کا تقرر پروفیسر کی حیثیت سے ہوگیا۔ اور وہ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک میں اسی طرح دلچسپی لیتے رہے۔

۱۹۳۸ میں سیدین ڈاکٹر ذاکر حسین کی خواہش پر ریاست جموں وکشمیر کے ڈائرکٹر تعلیمات مقرر ہوئے اور سات سال کے دوران انہوں نے جموں وکشمیر کے نظام تعلیم کو فروغ دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

۱۹۴۵ میں نواب رام پور کی خواہش پر ریاست رام پور کے مشیر کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا اور دو سال کے عرصہ میں انہوں نے رام پور اسٹیٹ کے تعلیمی معیار کو بلند کیا اور بعض نئی پالیساں وضع کیں۔

۱۹۴۷ میں خواجہ غلام السیدین کو ممبئی کے وزیر اعلیٰ کے تعلیمی مشیر کی حیثیت

سے خدمات حاصل کام کرتے رہے ممبئی میں تین سال مکمل کر لینے کے بعد مولانا آزاد کی ایماء پر محکمۂ تعلیم میں جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے اس کے بعد محکمۂ تعلیم میں ایڈوائزر کے عہدے پر مامور ہوئے۔ خواجہ غلام السیدین بارہ سال تک محکمہ تعلیم میں مولانا آزاد کے ساتھ کام کرتے رہے مولانا آزاد بھی مفکر تعلیم تھے۔ غلام السیدین کے ساتھ مل کر انہوں نے ہندوستان میں ایک نیا تعلیمی نظام قائم کیا۔ سیدین صاحب کو تعلیمی اداروں سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ انہوں نے اپنے دور اقتدار میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ہندوستان کے دیگر تعلیمی اداروں کی بہت مدد کی۔ نئے نئے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قیام اور تعلیم کے فروغ میں وہ نئے منصوبے تیار کرتے تھے۔

۱۹۶۱ء میں جب خواجہ غلام السیدین صاحب ایجوکیشن منسٹری سے سبکدوش ہوئے تو گورنمنٹ نے انہیں ایک بار پھر کشمیر میں ایجوکیشن ایڈوائزر مقرر کیا۔

خواجہ غلام السیدین تعلیم کے میدان میں بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے تھے انہیں بیرون ممالک کی مختلف یونیورسٹیوں میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ انہوں نے سارک فیلوفاؤنڈیشن کی دعوت پر امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں میں توسیعی لکچر دیئے۔

عالمی بینک مشن برائے عراق میں ایجوکیشن ایڈوائزر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ آسٹریلیا کے لئے نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے بین الاقوامی وفد کے ممبر رہے۔ لندن یونیورسٹی کے علاوہ انہوں نے ہندوستان کی مختلف یونیوسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں لکچر دئے۔

سیدین کی تعلیمی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت ہند نے انہیں پدم بھوشن کے خطاب سے نوازا۔ ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری تفویض کی۔

کولمبیا یونیورسٹی نے اپنی سلور جبلی کے موقع پر دنیا کے سات ممتاز ماہرین تعلیم کو ایک تمغۂ امتیاز اور سند پیش کی ان میں ڈاکٹر غلام السیدین کا نام بھی شامل تھا۔

اُردو افسانہ تحریک آزادی کے تناظر میں

اردو نثر کی دیگر اصناف کی طرح اردو افسانوں نے بھی آزادی کی تحریک میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ اور ہندوستان کے عوام کے قومی شعور کو بیدار کرنے میں معاون ثابت ہوئے جس سے حریت پسندوں کے عزائم میں اس تحریک کے تئیں پختگی پیدا ہوگئی۔

اردو میں مختصر افسانے کی روایت زیادہ پرانی نہیں ہے۔ افسانہ مغرب کے اثرات سے آیا اور بہت کم عرصہ میں نثر کی تقریباً تمام تخلیقی اصناف پر غالب آ گیا۔ اور ادبی حلقوں میں مقبول ترین صنف ادب تسلیم کیا جانے لگا۔ اردو افسانہ کی تاریخ میں پریم چند کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

پریم چند افسانے کا رہنما ہے کیونکہ پریم چند نے افسانے کو فن دیا اور اس فن کی تعمیر بھی کی۔ لیکن پریم چند کو افسانے کا موجد کہنا مناسب نہیں۔ پریم چند سے قبل بھی مختصر افسانے کے نمونے مختلف رسائل میں مل جاتے ہیں۔ ان رسائل میں خصوصاً دل گداز، اودھ پنچ، خاتون، خدنگ نظر، مخزن، الفاظ وغیرہ کے نام سامنے آتے ہیں۔ پریم چند سے قبل جن ادیبوں اور تخلیق کاروں نے مغربی افسانے کے فن اور اس کے تصور سے ادبی دنیا کو روشناس کرایا ان میں خاص طور پر سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر، جوش، راشد الخیری اور محمود علی بانکی پوری کے نام نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

وقار عظیم ''نیا افسانہ'' میں اردو افسانے کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

'' ناول کی طرح افسانہ بھی اردو میں انگریزی کے اثر سے آیا۔ ناول اس کے مقابلے میں ایک گمنام چیز بن کر رہ گیا۔ مختصر افسانے کی ابتداء ایک ایسے زمانے میں ہوئی جب ہندوستانی سماج میں سیاسی، معاشرتی اور قومی رہنما اس انتشار سے گھبرا

کر ملک کی نئی تحریک پھیلا کر عوام میں اپنے مٹتے ہوئے تمدن کی محبت اور ان کی جگہ لینے والے ایک نئے نظام کی طرف سے محنت کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔''[۱] (وقار عظیم ''نیا افسانہ'' ۱۹۷۷ء ص، ۱۷)

پریم چند کے بغیر اردو افسانے کی تاریخ ادھوری اور نامکمل نظر آتی ہے۔ پریم چند کا تخلیقی سفر ۱۹۰۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۶ء میں ختم ہو جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی معاشرہ پرانی قدروں کو چھوڑ کر نئے سماج میں قدم رکھ رہا تھا۔ مختلف قسم کی تحریکیں ابھر رہی تھیں۔ یہی وہ دور تھا جب پریم چند نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ پریم چند کی پہلی کہانی '' دنیا کا سب سے انمول رتن'' ۱۹۰۷ء میں ''زمانہ'' کانپور میں شائع ہوئی۔

افسانہ '' قاتل'' میں دھرم ویر ایک اہم کردار ہے جو ایک قوم پرست سبھا کا کارکن بھی ہے۔ اس کی بوڑھی ماں محبّ وطن ہے اور اعتدال پسند ہے۔ وہ دھرم ویر کے انتہا پسند رویّے کو پسند نہیں کرتی اور اس سبھا پر مختلف طرح سے اعتراضات کرتی ہے۔ دھرم ویر اپنی بوڑھی ماں سے کہتا ہے:۔

> ''جو تم کرتی ہو، وہی ہم کرتے ہیں، تمہارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے۔ ہمارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے۔''
>
> بوڑھی ہوں، جنگ آزادی میں دل و جان سے شریک تھی، دس سال قبل اس کا شوہر ایک باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں سزایاب ہوا تھا۔ جیل میں اس کی صحت خراب ہوگئی اور جیل ہی میں راہی عدم ہوا۔ تب سے یہ بیوہ عفت آمیز خلوص و انہماک سے خدمت قوم میں مصروف تھی۔''[۲]

(پریم چند ''قاتل'' ص، ۲۶)

''دھرم ویر، وہ، (انگریز) ہندوستان اسی وقت چھوڑیں گے جب انہیں یقین ہوجائے گا کہ وہ ایک لمحہ بھر بھی نہیں رہ سکتے۔ اگر آج ہندوستان کے ایک ہزار انگریز قتل کر دیئے جائیں گے تو آج ہی سوراج مل جائے گا، روس اسی طرح آزاد ہوگا۔ آئرلینڈ اسی طرح آزاد ہوا اور ہندوستان بھی اسی طرح آزاد ہوگا۔ کوئی اور طریقہ نہیں ہے ان کا خاتمہ کر دینا ہے۔ ایک گورے افسر کے قتل کر دینے سے حکومت پر جتنا خوف طاری ہوتا ہے اتنا ایک ہزار جلوسوں سے ممکن نہیں۔''[۳۲]

(پریم چند ''قاتل'' ص، ۲۶) عزیز فاطمہ ''اردو افسانے کا سماجی وثقافتی پس منظر'' ص، ۴۱۔

غرض کہ ابتدا سے آخر تک افسانے میں دھرم ویر انتہا پسند اور جذباتی نظر آتا ہے اور پورا افسانہ حب الوطنی کے جذبے سے معمور ہے۔

عزیز فاطمہ ''افسانے کا سماجی ثقافتی پس منظر'' میں لکھتی ہیں:۔

''ملکی و بین الاقوامی سیاسی تحریکیں اکثر افسانوں کا محرک رہیں، سیاسی تحریکیں چونکہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے افسانہ نگاروں کے مواد کو فراہم کرتی رہتی ہیں۔ سیاسی افسانوں کی ابتداء پریم چند سے ہی ہوتی ہے جن کی وجہ سے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سوز وطن'' حکومت نے ضبط کرلیا۔''[۳۳]

(عزیز فاطمہ ''اردو افسانے کا سماجی وثقافتی پس منظر'')

بیسویں صدی کا آغاز ہندوستان میں مختلف تحریکوں کو لے کر آیا۔ نئے رجحانات سامنے آئے، اور سیاست نے نیا موڑ لیا۔ ہندوستان کے علاوہ بھی دنیا کے مختلف خطے انتشار اور بے چینی کے عالم میں مبتلا تھے۔ سیاسی تحریکیں زوروں پر تھیں۔

چین، ترکی، اور ایران میں بھی یہی صورت نظر آتی تھی۔ اسی دوران یعنی ۱۹۰۶ء میں ہندوستان میں مسلم لیگ کا قیام بھی عمل میں آیا۔ جس کا ردعمل یہ ہوا کہ مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آ گئے۔ ادھر نوجوان طبقہ بھی متحرک ہو گیا۔ بعد ازاں ہندو مہاسبھا کی داغ بیل پڑی۔ یہی وہ دور تھا جب پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ ''سوز وطن'' ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ پریم چند کی کہانیوں میں حب الوطنی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اور ان سے بغاوت کی بو آتی تھی۔ جو انگریزوں کی جابرانہ عملداری کے خلاف تھی۔ لہٰذا حکومت نے ''سوز وطن'' کو ضبط کر لیا اور پابندی لگا دی گئی کہ وہ حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی بھی تحریر شائع نہیں کر سکتے۔ ''سوز وطن'' پانچ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان کہانیوں میں ''دنیا کا سب سے انمول رتن''، ''شیخ مخمور''، ''یہی میرا وطن''، ''صلہ ماتم''، ''عشق دنیا''، اور ''حب وطن'' شامل ہیں۔ پریم چند سوز وطن کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''ہر ایک قوم کا علم و ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے، جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینہ میں صورت ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشہ میں متوالے ہو رہے تھے اس زمانہ کی یادگار بجز عاشقانہ غزلیں اور چند خیالی کہانیوں کے اور کچھ نہیں۔ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے جب قوم کے نئے اور پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاحِ تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے کے قصص و حکایات زیادہ تر اصلاحی اور تجدید کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغت کے زینہ پر ایک اور قدم بڑھایا اور حب الوطنی کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر ابھارنے لگے۔ کیونکہ ممکن تھا کہ اس کا اثر

ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں اور یقیناً جوں
جوں ہمارے خیال وقیع ہوتے جائیں گے اس رنگ کے لٹریچر کو
روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی
اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب وطن کی عظمت کا نقشہ
جمائیں۔''[۱]

(قمر رئیس ''پریم چند شخصیت اور کارنامے، ص، ۳۱۔۳۳۰۔)

''سوز وطن'' کے افسانوں سے بغاوت کی بو آتی ہے اور ''حب الوطنی'' کے جذبات ابھرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' اس جملے پر ختم ہوتا ہے۔ ''وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے بیش قیمت شئے ہے۔

''یہی میرا وطن ہے'' سوز وطن کا تیسرا اور سب سے چھوٹا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسے شخص کی حب الوطنی کا مرقع ہے جو ساٹھ برس امریکہ میں آرام و آسائش کی زندگی بسر کر کے اپنے وطن کے دیدار کی تمنا لے کر اپنے پیارے وطن کو واپس آیا ہے۔

''عشق دنیا'' ''حب وطن'' کا موضوع بھی حب الوطنی ہے۔ اس افسانے میں اٹلی کی محبّ وطن ''میری'' کی حسرتناک زندگی کے چند عبرتناک مناظر کو بیان کیا گیا ہے، جو ہندوستانیوں کے دلوں کو بھی بہت متاثر کرتے ہیں۔

سوز وطن کی کہانیوں میں ''صلہ ماتم'' کو چھوڑ کر باقی چار کہانیوں میں ہمیں ایک ایسے سچے دردمند اور پرخلوص عاشق وطن کی روح مچلتی اور تڑپتی نظر آتی ہے، جو وطن کی ہر چیز اور خصوصاً وطن کی آزادی کو والہانہ جذباتیت کے ساتھ ایک روحانی انداز سے دیکھتا ہے۔ وطن کی آزادی اور وطن کی محبت کے احساس پر اقتصادی اور معاشی اہمیت نے آگے چل کر جو غلبہ حاصل کر لیا۔ اس کی جذباتیت اور روحانیت اس سے قطعی نا آشنا

ہے۔اس کے نزدیک وطن سے محبت کرنا اور اس پر اپنا تن من دھن نچھاور کر دینا انسانی فریضہ ہے۔

وقار عظیم ''داستان سے افسانے تک'' میں پریم چند کے افسانوں کی سیاسی اور قومی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے عبدالماجد دریا آبادی کی رائے کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''ہندوستان میں تحریک وطنیت کی تاریخ مؤرخ کا قلم آج سے سو پچاس برس بعد لکھے گا تو اس میں تیس بتیس برس کی تاریخ سمجھنے کے لئے جہاں گاندھی جی، موتی لال، جواہر لال، داس، محمد علی، انصاری، اور ابو الکلام آزاد کی تقریریں پڑھنی لازمی ہوں گی، وہاں پریم چند کے افسانے بھی ناگزیر ہوں گے۔''[۱]
>
> (وقار عظیم ''داستان سے افسانے تک'' ص،۲۶۳)

پریم چند محبّ وطن تھے انہیں وطن سے بے پایا محبت اور لگاؤ تھا۔ ہندوستان کے غریب عوام ہوں یا دیہاتوں کے کسان، وطن کی زمین ہو یا وطن کا ماحول وہ ان سے خاص انسیت اور محبت رکھتے تھے۔ ان کے افسانوں میں بھی یہی خیال پایا جاتا ہے۔ہنس راج رہبر پریم چند کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انہوں نے افسانوں کو اس طرح سے پیش کیا ہے کہ وہ وطن اور انسان کی خدمت کا ایک وسیلہ بن سکتا ہے۔ ان کی زندگی کے آخری دور تک ہندوستانی سیاست میں تیزی سے تغیر پیدا ہوتا جارہا تھا۔ پریم چند نے بڑی لگن کے ساتھ اس تغیر کا ساتھ دیا۔ کانگریس سے تو انہیں اپنی فکر کے لئے غذا ملتی رہتی تھی۔ لیکن ساتھ ہی وہ دوسری سماجی اور اصلاحی تحریکوں سے بھی اثر لیتے رہتے تھے۔ چنانچہ رانا ڈے، گوکھلے، تلک، لاجپت رائے وغیرہ

کی سماجی اور سیاسی اصلاح کی تحریکوں کا عکس ان کے افسانوں اور
ناولوں میں واضح طور پر ملتا ہے۔''

(اہنس راج رہبر ''پریم چند'' ص،۲۰۹)

پریم چند کے ان افسانوں میں جو خصوصاً جنگ آزادی کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ ڈامل کا قیدی، قاتل، آخری تحفہ، جیل، جلوس، آشیاں بر باد، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان افسانوں میں آزادی کی تحریکات اور تحریک ترک موالات کے واقعات بھی نظر آجاتے ہیں۔ افسانہ ''لال فیتہ'' میں سیاسی تحریکوں سے متاثر ہونے اور سرکاری ملازمتوں سے عوام کے مستعفی ہونے کے واقعات ملتے ہیں۔ پریم چند کے اسی نوع کے افسانوں میں ''راج ہٹ'' منزل مقصود' اور ''آہ بیکس'' شامل ہیں۔

افسانہ ''آخری تحفہ'' اس کے کردار سودیشی اور پکٹنگ کی تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں۔ اس میں امرناتھ اور مالتی دو اہم کردار ہیں۔ امرناتھ محبّ وطن ہے وہ ان تحریکوں میں زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ اسی طرح افسانہ ''جیل'' میں وشومبر کا کردار زیادہ نمایاں نظر آتا ہے وہ بی۔ اے کا طالب علم ہے اور اپنی تعلیم کی پرواہ کئے بغیر سودیشی تحریک میں حصہ لیتا ہے۔ روپ منی اس کی جرأت اور حوصلے کو خوش آمدید کہتی ہے اور اس کی تعریف کرتی ہے۔

افسانہ ''آشیاں بر باد'' میں عورتوں کی جدو جہد آزادی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار ''مرولا'' کی شکل میں پریم چند نے اس عورت کو پیش کیا ہے جو ظلم رسیدہ ہونے کے باوجود عالی ہمت اور بلند حوصلہ ہے۔ اور آزادی کی جنگ میں شریک ہے۔ اس کا بیٹا، شوہر اور ماں جنگ آزادی کی لڑائی میں مارے جا چکے ہیں۔ اس کے یہ الفاظ اس کی بلند حوصلگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

''.....ایک بار جی میں آیا بھی انہیں کے ساتھ چتا میں جا بیٹھوں،
سارا کنبہ ایک ساتھ، ایشور کے دیار میں جا پہنچے۔ لیکن پھر میں نے

سوچا تو نے ابھی ایسا کام ہی کونسا کیا ہے، جس کا معاوضہ یہ ملے۔''[۱]

(پریم چند'' آشیاں برباد'')

اس افسانے کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

'' ہم نے ایک درخت کے سائے میں اپنا دفتر قائم کیا اور کام کرتے رہے، شام کو ہم نے ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔..... لوگ کہتے ہیں جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں، مستعد ہیں۔ میدان سے ہٹتے نہیں۔ ہمیں اپنی ہار نہ ماننے والی خودداری کا ثبوت دینا تھا۔ دکھانا تھا کہ ہم تشدد سے اپنے مطالبہ آزادی سے دست بردار ہونے والے نہیں۔..... وہ (حکومت) یہ دکھانا چاہتی تھی کہ ہم تمہارے اوپر حکومت کرنے آئے ہیں اور حکومت کریں گے۔ تمہاری خوشی یا ناخوشی کی قوم کو پرواہ بھی نہیں، جلوس نکالنے کی ممانعت کردی گئی.....آج کانگریس کی صدارت کا فخر مجھے عطا کیا گیا تھا۔ میں دل میں ایک عجیب طاقت کا احساس کررہی تھی۔ ایک کمزور عورت جسے بولنے کا بھی شعور نہیں، جس نے کبھی گھر سے قدم نہیں نکالا۔ آج اپنے پیاروں کی قربانیوں کی بدولت اس مرتبے پر پہنچ گئی تھی جو بڑے بڑے سرکاری افسر کو بھی بڑے سے بڑے مہاراجہ کو بھی حاصل نہیں۔''[۱]

(پریم چند'' آشیاں برباد'')

دوسری جنگ عظیم کے بعد انگریزوں کے سفاکانہ مظالم نے اور بھی شدت اختیار کرلی جلیانوالہ باغ کا سانحہ، حکومت کا ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک، ہندوستانیوں کی اہانت اور استحصال، یہ سب وہ امور تھے جنہوں نے ہندوستانیوں کو زندہ اور بیدار

کرنے اور ان کے ارادوں کو مصمم بنانے کی فضا پیدا کر دگیا۔ سارا ملک آزادی کی لہر میں آ گیا۔ مسلمانوں میں اتحاد اور یک جہتی پیدا ہوگئی۔ وطن کی محبت نے کروڑوں عوام کے دلوں میں پرو دیا۔

۱۹۲۹ء میں جب سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ہی اردو کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اخباروں نے مضامین کے ذریعے اور ادیبوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ آزادی کے جذبہ کو بیدار کیا۔

اس سلسلے میں سردار جعفری رقمطراز ہیں:۔

''اردو والوں نے آزادی کی جدوجہد کو قومی دائرے تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے دائرے بین الاقوامیت سے ملائے اور اس طرح ایک زیادہ جاندار اور ہمہ گیر شعور کو عام کیا۔''[۲]

(صبا، حیدرآباد اردو کانفرنس نمبر، ص، ۸۹)

پریم چند نے اپنی تحریروں اور خصوصاً افسانوں کے ذریعہ ملک و قوم کی خدمت انجام دی۔ انہوں نے ایسے دور میں قدم اٹھایا جب ہندوستان سیاست کی آگ میں جل رہا تھا۔ انگریز حکمراں ہندوستان اور ہندوستان کے عوام کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ پورا ملک افراتفری کے عالم میں مبتلا تھا۔ حریت پسند اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے اور ان کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پریم چند نے ان تمام موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا، انہوں نے گاندھی جی اور دیگر سیاسی رہنماؤں کے سیاسی نظریات کو اپنے افسانوں کے ذریعے عوام تک پہنچایا۔

۱۹۳۶ میں پریم چند کی وفات ہوگئی لیکن انہوں نے اپنی زندگی میں اردو افسانہ نگاری میں جو چراغ جلائے تھے ان کی روشنی اردو ادب کی فضاؤں کو آج بھی منور کئے ہوئے ہے۔ ان چراغوں سے بعد کے افسانہ نگاروں نے کسب نور کیا اور پریم

چند کے خیالات وتصورات کی ترجمانی اپنے افسانوں کے ذریعے کی۔

اردو افسانہ پریم چند کے بعد

پریم چند کے بعد اردو افسانہ نگاروں میں ۱۹۳۶ کی ترقی پسند تحریک کے مصنفین کے نام نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

احتشام حسین بیسویں صدی کے اوائل میں سیاسی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ''انگارے'' کے پس منظر میں اس دور کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بیسوی صدی کے اوائل میں اپنی ابتداء ہی سے افسانہ میں یلدرم کے ہاتھوں جس رومانیت اور پریم چند کے ہاتھوں مثالیت پسندی کے باوصف جس حقیقت نگاری کی بنیاد پڑی تھی وہ الگ الگ باقاعدہ رجحان بن کر مستحکم روایتیں بن چکی تھی ''انگارے'' اور پھر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر حقیقی زندگی پر زور دی جانے لگی تھی۔ سماجی انتشار، قومی اتحاد، سیاسی بیچارگی طبقاتی استحصال، امن کی خواہش غربت اور افلاس متوسط طبقے کی اخلاقی اقدار کا کھوکھلا پن محبت پر پابندی، بیکار، جنسی گھٹن، ایثار، قربانی کی لگن، خاندانی زندگی کی ابتری، اور ایسے ہی دوسرے موضوعات سینکڑوں شکلوں میں افسانے بنے۔''[۱]

وقار عظیم ''انگارے'' کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''انگارے مغرب کے فن اور مشرق کی زندگی کے چھوٹے بڑے بہت سے اہم مسائل کا فنی امتزاج ہے۔ انگارے کی کہانیوں میں ہندوستان کی مذہبی، سیاسی اور سماجی زندگی اور ان سب کی پیدا کی ہوئی عجیب وغریب شخصیتوں اور ذہنیتوں کی تیکھی تصویریں بھی جن میں رورعایت کہیں نہیں اور آزادی اور بیبا کی، خیال ہر

جگہ ہے۔ ان کی مصوری میں تلخ طنز اور شدید احساس کی رنگ آمیزی ہے۔ اور اس تلخ طنز میں کہیں کہیں سنجیدگی اور ادبی اشاروں کے طرز کو چھوڑ کر تسخر اور جھلاہٹ اور بعض جگہ ابتذال کی شکل اختیار کر لی ہے۔''[۱]

(وقار عظیم ''نیا افسانہ'' ص ۶۳)

''انگارے'' کی اشاعت کے فوراً بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ وہ دور ملک میں قومی بیداری اور قومی شعور کا دور تھا۔ ملک کے سیاسی اور معاشی حالات اور برطانوی عملداری کے سخت رویوں نے ادیبوں اور تخلیق کاروں کے احساس کو جھنجھوڑا۔ بین الاقوامی سیاست نے بھی ہندوستان کی سیاست کو براہ راست متاثر کیا اور ادھر لوگوں کی توجہ انقلاب روس، فاسزم اور اس کے ساتھ دوسری جنگ عظیم کے امکانات نے ہندوستان کے عوام کو بھی اپنی جانب متوجہ کیا، یورپ اور امریکہ کے دانشور بھی ایک پلیٹ فارم پر آ گئے۔ اور متحدہ ہو کر عوامی تحریکوں میں حصہ لینے لگے۔ اس کے اثرات سے ہندوستان کے نوجوان، جو انگلینڈ کی مختلف دانش گاہوں میں زیر تعلیم تھے۔ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان نوجوانوں نے ایک ادبی حلقہ تشکیل کیا ان میں سجاد ظہیر، محمد دین تاثیر، محمد علی، ڈکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش اور پرمود سین گپتا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منعقدہ اپریل ۱۹۳۶ء لکھنؤ میں جو اعلان منظور کیا گیا اس کو ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:۔

''ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین روایتوں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس لئے زندگی کے جس شعبے میں ردعمل کے آثار پائے جائیں گے، انہیں اختیار کریں گے۔

ہم اپنی انجمن کے ذریعے سے ہر ایسے جذبہ کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں

کے تمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری پستی اور توہم پرستی کی طرف لے جارہے ہیں۔ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور ارادوں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں تغیر اور ترقی کے ذریعے سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔

انجمن کے مقاصد ہوں گے:

(۱) تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشاورتی جلسے منعقد کرکے اور لٹریچر شائع کرکے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

(۲) ترقی پذیر مضامین لکھنے.....اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جد وجہد کرکے اہل ملک کی آزادی کی کوشش کرنا۔

(۳) ترقی پسند مصنفین کی مدد کرنا۔

(۴) آزادیِ رائے اور آزادیٔ خیال کی حفاظت کرنا۔''[۱] (ہنس راج رہبر ''ترقی پسند ادب'' ایک جائزہ'' ۱۹۶۷ء ص ۲۲۔۲۲۱)

انجمن ترقی پسند مصنفین نے ابتدائی سے سیاست کے ساتھ براہ راست اپنا رشتہ جوڑ لیا تھا۔ بہت سے نوجوان ترقی پسند ادیب سیاست میں عملی حصہ لیتے تھے۔ کیونکہ ترقی پسند تحریک کا ایک مقصد رجعت پسند طاقتوں کے خلاف جدوجہد اور ملک کی آزادی کے لئے کوشش کرنا تھا۔

سجاد ظہیر جو ترقی پسند تحریک کے محرک تھے انہوں نے ایک کتاب ''روشنائی'' کے نام سے تصنیف کی تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے ترقی پسند تحریک کا تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ تحریک کے اغراض و مقاصد اور اس کی تاریخ بھی بیان کی

ہے۔ سجاد ظہیر ''روشنائی'' میں ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

''ترقی پسند ادبی تحریک کا رخ ملک کے عوام کی جانب، مزدروں، کسانوں، اور درمیانہ طبقہ کی جانب ہونا چاہیے۔ ان کو لوٹنے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا، اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور، حرکت، جوشِ عمل اور اتحاد پیدا کرنا اور ان تمام آثار اور رجحانات کی مخالفت کرنا جو جمود، رجعت اور پست ہمتی پیدا کرتے ہیں۔ ہم شعوری طور پر اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد اور وطن کے عوام کو اپنی حالت سدھارنے کی تحریکوں میں حصہ لیں۔ صرف دور کے تماشائی نہ ہوں، ترقی پسند ادیب کے دل میں نوع انسان سے انس، اور گہری ہمدردی ضروری ہے۔ بغیر انسان دوستی، آزادخواہی اور جمہوریت پسندی کے ترقی پسند ادیب ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے ہم اعلانیہ طور پر ادبی تحریک کا رشتہ آزادی اور جمہوریت کے ساتھ جوڑنا چاہتے ہیں کہ ترقی پسند دانشور مزدوروں اور غریب کسانوں اور مظالم عوام سے ملیں۔ ان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا حصہ بنیں۔''[۱]

(سجاد ظہیر ''روشنائی'' لاہور ایڈیشن ص، ۷۶، ۷۸)

مذکورہ اقتباس سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ جہاں ترقی پسند تحریک کا مقصد زبوں حالی اور درمیانہ طبقہ کی حمایت، سماجی استحصال کی مخالفت اور سماج میں پھیلی ہوئی بے چینی کو دور کرنا تھا وہاں اس کا ایک اور اہم مقصد انگریزوں کی مخالفت اور آزادی کی حمایت تھا۔

انجمن کی کل ہند کانفرنس دوسری جنگ عظیم کے دوران ۱۹۴۲ء میں دہلی میں

منعقد ہوئی۔ ترقی پسند مصنفین جمہوری حقوق کی حمایت میں اپنی آواز بلند کر چکے تھے اس اجلاس میں ترقی پسند ادیبوں کی جانب سے ایک قرارداد پیش کی گئی اور اس قرارداد میں کہا گیا کہ:

''ہم برطانوی سامراج کے اس رویے کی مذمت کرتے ہیں کہ وہ ان حالات میں ہمارے وطن کو آزادی دینے کے لئے تیار نہیں۔''[۱] (سجاد ظہیر ''روشنائی'' ص، ۲۸۷)

حسرت موہانی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی اہمیت اور اس کے مقاصد کو واضح کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہمارے ادب کو قومی آزادی کی ترجمانی کرنی چاہیے۔ اسے سامراجیوں اور ظلم کرنے والے امیروں کی مخالفت کرنی چاہیے۔ اس میں عوام کے دکھ سکھ، ان کی بہترین خواہشوں اور تمناؤں کا اس طرح اظہار کرنا چاہیے جس سے ان کی انقلابی قوت میں اضافہ ہو اور وہ متحد اور متکلم ہو کر اپنی انقلابی جد وجہد کو کامیاب بنا سکیں۔''[۲]

(سجاد ظہیر ''روشنائی'' ص، ۲۸۷)

پریم چند کی افسانہ نگاری اور ''انگارے'' کی اشاعت کے بعد ترقی پسند تحریک نے بھی اردو افسانے کو بہت متاثر کیا۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے سماجی، سیاسی، اور معاشی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ پریم چند کے بعد افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور سہیل عظیم آبادی کے نام خاص ہیں۔

افسانہ نگاروں میں پریم چند کے بعد سب سے زیادہ معتبر نام کرشن چندر کا ہے۔ کرشن چندر نے ناول اور افسانہ دونوں میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

ان کے افسانوں میں خوبصورت مناظر، فطرت کی عکاسی کے ساتھ ساتھ سماج کی تلخ حقیقتوں نیز سیاسی حالات و واقعات کی بھرپور تصویر کشی ملتی ہے۔ معین عقیل نے کرشن چندر کے موضوعات اور رجحانات کے بارے میں لکھا ہے:۔

''کرشن چندر کے انقلابی رجحانات کے زیر اثر جنگ، سامراج اور فاشیت بھی موضوع بنے ہیں اور ان کے موضوعات میں سماجی اور سیاسی زندگی کے مختلف پہلو شامل ہیں۔ ایک مخصوص سماجی اور سیاسی ماحول میں رہ کر ایک مخصوص نظریئے کے تحت انہوں نے افسانے لکھے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ہمیں جو ماحول ملتا ہے وہ سیاسی طور پر غلام اور سماجی طور سے پس ماندہ ہے اور ان دونوں کے اسباب انگریز قوم اور سرمایہ دارانہ نظام ہیں، ہر طرف بھوک ہے، قحط اور غلامی ہے۔ ہر افسر ایک ظالم اور سفاّک افسر ہے۔ جسے اس ملک کے عوام سے کوئی ہمدردی نہیں۔ یہ ماحول کرشن چندر کو انسان دوستی اور غلامی کے خلاف شدید نفرت کے اظہار سے انسان کی آزادی اور ہندوستان کی آزادی کے پرچم کو ہمیشہ بلند رکھا۔''[۱] (تحریک آزادی میں اردو کا حصہ معین عقیل، ص، ۷۷۔۵۷۶)

۱۹۳۶ء کے بعد افسانہ نگاروں نے جو افسانے تخلیق کئے ان میں کرشن چندر کا افسانہ ''دو فرلانگ لمبی سڑک'' احمد علی کے افسانے ''ہماری گلی'' اور ''میرا کمرہ'' منٹو کا ''نیا قانون'' حیات اللہ انصاری کا افسانہ ''آخری کوشش'' موضوع اور فن کے اعتبار سے بہترین افسانے تصور کئے جاتے ہیں۔

ان سے ذرا آگے بڑھ کر احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، ابراہیم جلیس، اختر اورینوی، حسن عسکری، بلونت سنگھ اوپندر ناتھ اشک اور خواجہ احمد عباس کے نام بڑی

اہمیت کے حامل ہیں۔

احتشام حسین اس دور کے ادیبوں کی نگارشات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس زمانہ میں اردو ادیبوں کی کاوشوں میں تین خواہشات کی جھلک واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ ہندوستان کا جسم زخمی نہ کیا جائے۔ فرقہ واریت انگریز سیاست کی ناجائز اولاد ہے اس کا گلا گھونٹ دیا جائے اور اگر ہندوستان کی تقسیم ہونا ہی ہے تو مہاتما گاندھی کے الفاظ میں اس کی تقسیم اس طرح ہو کہ جیسے بھائی بھائی اپنی ملکیت تقسیم کرتے ہیں یعنی یہ تقسیم انگریزوں کے ہاتھوں سے نہ ہو بلکہ آپس کے سمجھوتے کا نتیجہ ہو۔''[۱]

(احتشام حسین ''روایت اور بغاوت'' ص،۱۷۹)

پریم چند اور کرشن چندر کے بعد افسانہ نگاری کی دنیا میں ایک اور معتبر نام سعادت حسن منٹو کا ہے۔ منٹو ایک اعلیٰ پائے کا افسانہ نگار تھے۔ ان کا فنی شعور اور فکر، رجحانات اور خیالات اپنے معاصرین سے مختلف ہیں۔ ایک طرف منٹو نے جنسی مسائل اور معاملات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے تو دوسری طرف اپنے عصری سیاسی مسائل سے بھی باخبر نظر آتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں سیاسی مسائل سے بحث کرتا ہے۔

معین عقیل منٹو کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''منٹو کا فنی شعور افسانہ نویسی کے لئے زیادہ موزوں تھا۔ ان کے عام افسانوں میں طوائف کی زندگی اور جنسی الجھنوں سے دوچار نوجوانوں کے علاوہ ہندوستان کی سیاسی بیداری کے مناظر، سیاسی جلسے، جلوسوں پر پولیس کی گولہ باری، گلیوں بازاروں میں مسلح فوج کا راج، جیل خانے، مارشل لا، بغاوت کو ختم کرنے والی برچھیاں

اور گولیاں، ایک نئے قانون کی خواہش، انقلاب کے نعروں کی
گرما گرمی جیسے موضوعات بکثرت ملتے ہیں ان کے بے شمار
موضوعات میں خصوصیت سے ہندوستان کی سیاسی زندگی کی منظر
کشی ہے۔''[۲] (تحریک آزادی میں اردو کا حصہ۔ص، ۳۷۷)

منٹو نے ایک خاص دور کے سیاسی معاملات وکوائف کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ان کے جن افسانوں کو خاص اہمیت حاصل ہے اور جو سیاسی حالات کی مکمل طور پر ترجمانی کرتے ہیں۔ ان میں ''نیا قانون''، نعرہ''، ''شرابی''، تماشا''، ''ماتمی جلسہ''، ''دیوانہ شاعر'' اور سوراج کے لئے اہم ہیں۔

منٹو کا افسانہ ''تماشہ'' ۱۹۱۹ء کے مارشل لا کے ہنگاموں کو پیش کرتا ہے۔ ''شرابی'' اس کے بعد کے واقعات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں منٹو نے تحریک عدم تعاون کی جدو جہد اور اس کے نتیجے میں افراد کی گرفتاری اور ان کی رہائی کے بعد کی زندگی کے سیاسی انداز اور صورتحال کو پیش کیا ہے۔ افسانہ ''شرابی'' کے چند اقتباسات ذیل میں نقل کئے جارہے ہیں۔

''آہ آزادی..... خدا معلوم اس کا ذائقہ کس قدر لذیذ ہوگا۔ ان
آزاد لوگوں کی حالت پڑھتا ہوں تو مجھے ایک افسانہ سا معلوم
ہوتے ہیں۔ میں اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہم بھی کبھی
آزاد ہوں گے..... اس کا جواب مجھے نہیں ملتا۔''[۱]

(منٹو افسانہ ''شرابی'')

افسانہ نگار اپنی غلامی، بے بسی، اور مظلومی کا احساس اس طرح بیان کرتا ہے۔

''قصوروار ہر حالت میں وہ لوگ ہیں جو ہماری گردنوں پر ظلم کی
تلوار لیے کھڑے رہتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا ''ہندوستان
کے ۲۵ کروڑ باشندے اپنی چھپی ہوئی آزادی حاصل کر لیتے اگر

ظلم کا کٹا ہاتھ ان کی گردنوں کو نہ دبائے ہوتا۔ وہ ڈراتے ہیں اور
ہم اس لئے ڈر جاتے ہیں کہ ہمارے جسم کا ہر عضوان کے ظلم سے
مفلوج ہے.....''[۲] منٹو افسانہ ''شرابی''

'' کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس ٹڈی دل پر کتنے لوگ حکومت
کر رہے ہیں، آپ ان کو انگلیوں پر گن سکتے ہیں..... حاکم ہرگز
ملعون و مطعون نہیں ہو سکتے ہمارا وطن خوف میں لپٹا ہوا ہے۔ اس
دھند کو دور کر دیجئے پھر آپ کو ہر چیز روشن نظر آئے گی۔''[۳]

(منٹو افسانہ ''شرابی'')

منٹو کے افسانے ''نیا قانون'' کا مرکزی کردار منگو کوچوان ہے۔ جو غیر تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی عصری حالات سے باخبر اور سیاسی طور پر بیدار نظر آتا ہے۔ منگو انگریزوں سے سخت نفرت کرتا ہے۔ افسانے میں ایک جگہ منگو انگریزوں کے بارے میں کہتا ہے:۔

'' (انگریز) آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک بن گئے۔
ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گا
نٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں..... (نیا قانون)

محمد حسن ملک کے سیاسی تناظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے منٹو کی افسانہ نگاری کا جائزہ اس طرح لیتے ہیں:

'' ملک میں آزادی کی لہر تیزی سے پھیل رہی تھی ملک کی غلامی کو
غربت، جہالت، بیروزگاری اور ساری دوسری اقتصادی اور
اخلاقی گراوٹوں کا سبب قرار دیا جانے لگا تھا۔ منٹو بھی ان عصری
تقاضوں سے متاثر ہوا اور اس نے چند اچھے افسانے بھی لکھے
جن کا مقصد سیاسی اور سماجی بیداری کی اس لہر کو ہوا دے کر عوام

کے دلوں میں بغاوت کے جذبات کو بھڑکانا تھا۔''[۲]

(محمد محسن ''منٹو اپنی تخلیقات کی روشنی میں'' ۱۹۸۲ء ص،۱۲۱)

منٹو نے جہاں ایک طرف اپنے افسانوں میں جنسی مسائل سے بحث کی وہاں انہوں نے آزادی کی تحریکات کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ان کے افسانوں میں جلیا نوالہ باغ کا حادثہ، احتجاجی جلسے،آزادی کے متوالوں پر مظالم اور آزادی کی تڑپ محسوس کی جاسکتی ہے۔منٹو کے اس طرح کے افسانوں میں ''نیا قانون'' اور ''نعرۂ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور ''ساوتری'' ہندوستان کی تقسیم پر ایک فنکارانہ طنز ہے۔منٹو کے بیشتر افسانے سیاسی اور سماجی ناہمواری بے راہ روی اور ناانصافی پر ان کے تاثرات پیش کرتے ہیں۔

اردو افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سیاست کے بھی گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر معین عقیل کا خیال ہے کہ:۔

''احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں میں جو ماحول پیش کیا ہے وہ بڑا وسیع ہے اس میں زندگی کچھ محدود نہیں۔اس کی معاشرتی، اخلاقی اور معاشی زندگی پر ملکی سیاست اور بین الاقوامی سیاست اور معاشیات کا اتنا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے کہ انہیں مجرد حالت میں دیکھنا ممکن نہیں۔ان کے افسانوں میں پنجاب کے دیہات کے مخصوص رومانی مناظر اور اس کی زندگی کی روح اور مرکز چوپال کے علاوہ انقلاب زمانہ،عصری تحریکات خصوصاً خلافت تحریک،انقلاب وآزادی کی جدوجہد،ایسے موضوعات ہیں جن کا افسانوں میں گہرا عکس موجود ہے۔''[۱] (تحریک آزادی میں

اردو کا حصہ۔ص، ۵۸)

احمد ندیم قاسمی نے خصوصاً پنجاب کے دیہاتوں کی رومانی فضا کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔انہوں نے اپنے دور کی تحریکوں بالخصوص آزادی کی جدوجہد کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ان کا افسانہ ''ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد'' دوسری جنگ عظیم کے حالات وکوائف کے پس منظر میں تخلیق ہوا۔

ابراہیم جلیس نے بھی سیاسی حالات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ غیر ملکی ناجائز سیاسی تسلط اور سیاسی اقدار کو ختم کرنے کا نعرہ لگایا۔اور ملک میں پھیلی ہوئی معاشی بدحالی کا ذمہ دار بھی انگریز کو قرار دیا۔جلیس کے اس طرح کے افسانوں میں ''چالیس کروڑ بھکاری''، زرد چہرے'' تکونا دیس''، عریاں''، '' تیری اور میری آنے والی نسل'' ایسے متعدد افسانے ہیں جن میں انگریز عملداری کے ظلم و استبداد، فرقہ واریت، کسانوں کے استحصال کی سخت مخالفت کی گئی ہے جو اپنے عہد کے سیاسی اور معاشی حالات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

پریم چند سے لے کر ترقی پسند تحریک تک اردو کے تقریباً سبھی افسانہ نگاروں نے عصری سیاسی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور آزادی کی تحریکات میں ایک نئی روح پھونکی۔

☆☆☆

''آخری سواریاں''

آخری سواریاں سید محمد اشرف کا اہم تخلیقی کارنامہ ہے۔ اشرف اردو کے ایک ایسے بے لوث اور سچے تخلیقی فن کار ہیں جنہوں نے تخلیق اپنا پیشہ نہیں بنایا یہ تو محض ان کے ذوق کی تسکین اور تفنن طبع کا ذریعہ کہا جا سکتا ہے۔ اشرف نے اپنی محنت شاقہ، ذہانت فطانت اور تخلیقی فن پاروں کے ذریعہ نہ صرف اہل علم و دانش کو اپنی جانب متوجہ کیا بلکہ عوام و خواص میں بھی اپنی علمیت کا لوہا منوانے کی سعی کی۔ ''آخری سواریاں'' اردو حلقو میں بحث کا موضوع رہا۔ اس سے قبل بھی ان کے متعدد افسانے اور ناول شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ لیکن آخری سواریاں نسبتاً ان کا کمزور ناول ثابت ہوا۔

اشرف کے تخلیقی سر چشمے صرف فکشن تک ہی محدود نہیں ہیں ان کے تخلیقی کرب کا سیلِ رواں ادب کی مختلف النوع اصناف میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً حمد و نعت، نظم، غزل، مرثیہ، منقبت اور قطعہ و رباعی کے علاوہ دیگر اصناف میں بھی انہوں نے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔

لفظوں کے برجستہ اور برمحل استعمال پر انہیں ماہرانہ قدرت حاصل ہے نثر لکھتے وقت الفاظ کے انواع و اقسام کا سیل رواں امڈتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایسے الفاظ جو متروک ہو چکے ہیں یا جن کا چلن کم ہوتا جا رہا ہے اشرف انہیں بڑی تازہ کاری کے ساتھ زندہ کر دیتے ہیں اور نئے معنی و مفاہیم کے ساتھ برتتے ہیں جس سے ایک پر کیفیت فضا قائم ہو جاتی ہے اور لفظوں کی معنویت اور حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اشرف کی نثر نے مجھے اس وقت متاثر کیا جب میں نے عینی آپا کی وفات پر کتاب نما کے کسی شمارے میں ان کی تعزیتی رپورتاژ پڑھی اور تین بار پڑھی۔ اشرف کی نثر بڑی توانا، خوبصورت، بامعنی اور مربوط ہوتی ہے۔ بیانیہ پر انہیں دسترس حاصل ہے۔

اشرف کی ہر نئی تخلیق چاہے وہ افسانے کی شکل میں ہو یا ناول کی صورت میں ان کے ادبی استناد کے رتبہ میں اضافہ کر دیتی ہے۔

بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ اشرف کا قلم ایک فن کار کا قلم ہے ان کا مزاج ایک سچے اور کھرے تخلیق کار کا مزاج ہے اشرف کی خلاقانہ طبیعت نے ادب کو جو فن پارے عطا کیے وہ ان کی ذوقی اور وجدانی کیفیات کا نتیجہ ہے۔

صغیر افراہیم کی کتاب ''افسانوی ادب کی نئی قرأت'' میں اشرف پر ''آخری سواریاں طرب و کرب کا علامتی اظہار کے موضوع پر ایک تحقیقی مضمون شامل ہے۔ جس میں اشرف کے شخصی اور فنی پہلوؤں سے خاطر خواہ بحث کی گئی ہے اور خلاقانہ مہارت پر بعض اہم گوشے تلاش کرنے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔

اشرف کا خانوادہ اگر چہ روحانی وجدان کی شاندار روایت کا امین ہے لیکن اس خانوادے نے روحانی عرفان کو کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا بلکہ اس خاندان کے افراد حکومتِ ہند کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہے اور خدمت خلق کو اپنا وطیرہ قرار دیا۔ اور بین الاقوامی سطح پر بے شمار ارادت مندوں کو فیض یاب اور سیراب کیا۔

تہذیب و تاریخ اور مقامی زبانوں پر ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ ایک ذہین اور باخبر تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ IRS افسر رہے اور اب سبکدوش ہو کر علی گڑھ میں مقیم ہیں۔

''آخری سواریاں'' ناول نگار کا ایک ذوقی اور وجدانی تجربہ ہے اور اپنے اس تخلیقی تجربہ کو نہایت ہی فن کارانہ انداز میں بڑی چابک دستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ناول کو پڑھتے وقت کہیں کہیں تمثیل کا گمان بھی ہونے لگتا ہے۔ جو پورے ناول پر ایک مرکزی کردار بن کر ابھرتا ہے۔ کرداروں کا لباس، بود و باش، زبان و بیان اور لہجہ نہایت ہی فطری اور غیر معمولی ہے بعض جگہوں پر قدرے طوالت بھی نظر آتی ہے لیکن ناول نگار اس Situation کو بڑی خوبصورت سے نبھانے میں کامیاب ہے۔

آخری سواریاں ایک کامیاب ناول ہے لیکن ایک سوالیہ نشان ضرور چھوڑتا ہے اور ہمیں تہذیب وثقافت اور زبان وادب کے تحفظ کے تئیں متنبہ کرتا ہے۔ ناول کے بعض کردار مقامی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں ماضی کی تاریخ سے ادبی قدروں کا تانا بانا جڑا ہوا ہے ناول کا مطالعہ کرتے وقت معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ناول کے پلاٹ نے کب تاریخ سے زبان اور پھر ادب کی جانب سفر اختیار کرلیا۔

ابتدا میں تو پلاٹ بڑا مبہم سا معلوم ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ ماحول، پس منظر اور کرداروں کی زبان سے گرہ کھلنے لگتی ہیں اور Climax تک پہنچتے پہنچتے ناول کا مدعا واضح ہوجاتا ہے۔ کہیں کہیں ناول کی زبان سے داستانوی رنگ بھی جھلکنے لگتا ہے۔ انواع واقسام کے کھانوں، لباس، بودوباش، ریت رواج، قاری کے ذہن کو مسحور کردیتی ہے۔ یہ ناول دو مختلف طبقوں کے کردار دو ہندوستانی تہذیبوں میں یگانگت، گنگا جمنی مشترکہ تہذیب کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔

خالد جاوید نے ''اردو ادب'' کے ایک شمارے میں کتاب اور صاحب کتاب کے عنوان سے ''آخری سواریاں'' پر ایک مبسوط اور جامع تبصرہ کیا ہے۔ خالد جاوید نے ناول کے مختلف پہلوؤں پر بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ عالمانہ انداز میں تجزیہ کیا ہے اور بعض اہم حوالے بھی نقل کیے ہیں اس تبصرے کو آخری سواریاں پر ایک اہم اور معیاری تبصرہ تسلیم کیا گیا ہے۔ خالد جاوید نے ناول کو دو شقوں میں تسلیم کرنے کی جانب اشارہ کیا ہے۔ دراصل ناول کا ایک ہی مربوط پلاٹ ہے اسے دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ تہذیبی اعتبار سے ناول کے دو مختلف پہلو ضرور ہیں۔

''آخری سواریاں'' اشرف کا ایسا تخلیقی کارنامہ ہے جس نے اردو کے صف اول کے ناول نگاروں کی صف میں لا کھڑا کردیا اس کا اعتراف قرۃ العین حیدر اور قاضی عبدالستار جیسے باوقار تخلیق کاروں نے بھی کیا ہے۔

اس ضمن میں صغیر افراہیم کا اداریہ جو ''تہذیب الاخلاق'' کے اگست ۲۰۱۶ء

کے شمارے میں شائع ہوا ہے قابل ذکر ہے۔ اس اداریے میں مدیر نے آخری سواریاں سے تفصیلی بحث کی ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد ناول کو سمجھنا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔

''مغلیہ سلطنت کی یہ بڑی خوبی قرار پائی کہ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی تہذیب کے طور پر زبان اردو کو فروغ ہوا۔ مغلیہ دور کی شان و شوکت کے اگر ڈیڑھ سو سال قرار پاتے ہیں تو اس کے زوال میں بھی اتنا ہی عرصہ لگا ہے مگر اردو کسی کی جاگیر نہیں ہے۔ سلطنت نہیں مشترکہ تہذیب کی علم بردار ہے جو عوام و خواص کے دلوں پر حکومت کرتی رہی ہے۔ ملی جلی تہذیب کی امین ہے۔ اپنے چاہنے والوں کے ایک بڑے حلقے میں معتوب کیوں کر ہوگئی۔ حیرانی کا سبب ہے اپنے ہی جائے مسکن میں اس کی کسمپرسی کی یہ عبرتناک داستان ضروری ہے مگر فن کاروں کا لہجہ حکیمانہ اور درویشانہ ہے۔''

(اداریہ تہذیب الاخلاق، جلد ۳۵، شمارہ ۱۸۰، اگست ۲۰۱۶ء)

''مغل سلطنت سب سے زیادہ موثر سلطنت تھی۔ وہ جیسے اپنے آپ بولی: گنگا جمنی تہذیب کی ماں اس تہذیب نے برسوں اس سلطنت کی چھاتیوں سے لگ کر دودھ پیا ہے۔''

(آخری سواریاں)

صغیر افراہیم اپنے اداریے میں مزید رقمطراز ہیں کہ:

''صرف اڑسٹھ سال میں ہمارا یہ حال ہو گیا کہ ہم نے اردو کے گھر میں اردو کو یتیم و یسیر بنا ڈالا۔''

(اداریہ تہذیب الاخلاق، اگست ۲۰۱۶ء)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ گنگا جمنی تہذیب کے طور پر زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ ''آخری سواریاں'' دراصل علامت ہے ادبی قدروں کے زوال، زبان کی پامالی، ناانصافی اور بے راہ روی کی۔

''آخری سواریاں'' خلق کرتے ہوئے ناول نگار نے جو ماحول منعکس کیا ہے اس میں قاری نمناک فضا اور دل کو مسوس لینے والی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے اور غیر محسوس طور پر اس کے ذہن پر یہ نقش ہوجاتا ہے کہ اردو زبان جس کو معصومیت اور الفت کے نغمے بکھیرے، گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دیا محبت اور مساوات کو گلے لگایا اس سے چشم پوشی، بیزاری اور بغض کیوں؟''

(اداریہ تہذیب الاخلاق، اگست ۲۰۱۶ء)

مزید برآں صغیر افراہیم ناول کے کلائمکس (Climax) کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نہایت ہی فکر انگیز جملہ رقم کرتے ہیں:

''زبان کو دفنانا دراصل تہذیب کی موت ہے اور تہذیب کو دفنانا اتنا دردانگیز ہوتا ہے کہ چٹانیں بھی چیخ اٹھتی ہیں۔''

(اداریہ)

وہ زبان جس نے خلوص و یگانگت کے نغمے گائے مشترکہ کلچر کو فروغ دیا۔ انقلاب زندہ باد کا نعرہ دیا۔ سوتوں کو جگایا لیکن اچانک دوقومی نظریات کی بنیاد پر دیکھتے ہی دیکھتے اردو کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اور اپنے ہی گھر آنگن میں نفرت اور تعصب کا شکار ہوکر رہ گئی۔

اردو کی زبوں حالی کا بیان ناول نگار اپنی زبان میں اس طرح کرتا ہے:

''ریڈیو اور ٹی وی پر غزلیں بہت آتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے یہ گلوکار اور گلوکارائیں پھٹے حال اور ادھیڑ عمر لوگوں کو بلا کر مرتے

ہوئے صحیح تلفظ اور لفظ کی ادائیگی کی مشق کرتے ہیں جب یہ ادھیڑ عمر بوڑھے مر گئے تب کیا ہوگا۔

(آخری سواریاں)

ناول نگار اردو تہذیب کی بے حرمتی کا ذکر اس انداز میں کرتا ہے:

''ایوانوں میں نمائندے بے وزن شعر پڑھتے ہیں اور ہمارے دل میں گدی گدی ہونے لگتی ہے ہماری گدی گدی اور چہرے پر پھیلی تعریف دیکھ کر وہ خوش ہوتے ہیں کہ چلو بغیر محنت کے کام بن گیا۔ سلک کی بھاری بھاری ساڑیاں پہن کر گلوکارائیں صوفی غزلیں گاتی دلوں کو اچھی لگتی ہیں لیکن ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے بھوکے سازندوں کے زرق برق لباس کے نیچے میلی بنیانیں ہوتی ہیں ان کے ہاتھوں پر اتنے گڈھے پڑے ہیں کہ اتنے سکے بھی نہیں ملتے۔'' (آخری سواریاں)

یہاں خالد جاوید کی رائے سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ:

''اشرف نے ساٹھ کی دہائی کے اجتماعی ذہن کو ناقابل فراموش دولت سے نوازا ہے۔''

آخری سواریاں ادبی تہذیبی اقدار، تاریخ و تمدن اور ہندو مسلم ثقافت کی زوال پذیر تہذیب کی علامت بن کر ابھرا ہے:

'' آخری سواریاں بڑی تیزی سے گذر رہی ہیں اف! دیکھو یہ بالکل ہمارے پاس سے سواری گذری اس میں موسیقی کے آلات، مثنویوں، قصیدوں، مرثیوں، رباعیوں، بارہ ماسوں، قصوں، کتھاؤں اور داستانوں کے دفتر کے دفتر کتنے پھوہڑ انداز میں لادر کھے ہیں، خطاطی کے بیش قیمت نمونے قدم قدم پر زمین پر

گرتے جاتے ہیں۔''

مدیر تہذیب الاخلاق اداریہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

''یکے بعد دیگرے گذرتے ہوئے قافلے، پس منظر اور پیش منظر سے متعارف کراتے ہیں۔ ایسے قافلوں کی آخری سواریاں محض ذہنی تناؤ میں مبتلا کرتیں بلکہ حسین یادوں کے توسط سے غور وفکر کی مثبت راہوں کو روشن کرتی ہیں۔''

فرحت احساس نے تو ''آخری سواریاں کو ثقافتی وفات کا نوحہ تک کہہ دیا'' جو افسانے کی تخلیقی نثر میں شاید پہلی بار پڑھا گیا۔

بہر حال ماضی کی شان وشکوہ کے آئینے اور حال کے منظر نامے میں آخری سواریاں کئی علامتوں سے تعبیر ہے۔

ناول نگار آج بھی پر امید ہے کہ زبان و ادب کی زوال پذیر اور پامال قدریں کیا ایک بار زندہ ہوسکتی ہیں اور اسے انتظار ہے کہ نظروں سے غائب ہوتی ہوئی سواریاں کسی دوسرے موڑ سے واپس آتی ہیں کہ نہیں۔

☆☆☆

سرسید کا خط کرنل گراہم کے نام

گراہم حکومت برطانیہ میں کرنل کے عہدے پر فائز تھا۔ وہ سرسید کی دلنواز شخصیت سے ہمیشہ متاثر رہا۔ اس کی یہ خواہش رہتی تھی کہ سرسید جہاں بھی رہیں وہ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارے، ان کی محفلوں اور صحبت میں شامل رہے۔ سرسید کے زمانۂ ملازمت میں جہاں بھی سرسید کا تبادلہ ہوتا گراہم بھی وہیں اپنا تبادلہ کرالیتا۔ اور وہ پابندی کے ساتھ ہمیشہ ان کی مختلف میٹنگوں میں شریک ہونے کا متمنی رہتا۔ گفتگو کے دوران سرسید کی زبان سے نکلے ہوئے لفظوں اور جملوں کو بڑی سنجیدگی سے سنتا اور ان کے ہر عمل اور حرکت پر نظر رکھتا۔ اور انہیں بڑی دیانت داری سے قلم بند کر دیتا۔ ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد گراہم کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کیوں نہ سرسید کی زندگی پر مبنی اس قیمتی سرمایے کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کرایا جائے۔ گراہم کی ذاتی دلچسپی اور سرسید سے بے پناہ لگاؤ کے نتیجہ میں گراہم کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور ۱۸۸۵ء میں گراہم کی سرسید پر ایک کتاب بعنوان ''Life & Work of Sir Syed Ahmad Khan انگریزی میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔ جو نہایت ہی معتبر اور مستند تصور کی گئی۔

کرنل گراہم اس کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:

> ''ستمبر کے اواخر میں سرسید سے میری ملاقات علی گڑھ میں ہوئی میں نے سرسید سے ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ سوالات کیے کیوں کہ میں ان کی حیات وخدمات پر ایک مقالہ قلم بند کرنا چاہتا تھا اس ضمن میں انہوں نے میری درخواست قبول

کر لی آ گرہ واپس آنے پر میں نے سرسید پر مضمون لکھنا شروع کر دیا۔ مضمون اتنا طویل ہوتا گیا کہ اس میں سب کچھ سمونا مشکل معلوم ہونے لگا۔ لہٰذا میں نے یہ طے کیا کہ سرسید پر ایک "Monograph" کتابی شکل میں تحریر کر دیا جائے جو ملک کے نوجوانوں کے لیے یہ مشعل راہ ثابت ہو سکے۔ سرسید نے مجھے اکتوبر ماہ میں حیدرآباد کے وزیر نواب سالار جنگ سے ملاقات کے لیے علی گڑھ مدعو کیا اس موقع کو غنیمت سمجھ کر میں نے سرسید سے ان پر ایک کتاب لکھنے کی اجازت مانگی اس وقت سرسید نے قدرے تامل کرتے ہوئے اپنی زبان سے یہ الفاظ کہے۔ "No life No life yet" مگر دوستوں کے اصرار پر انہوں نے ایک لمحہ کے لیے سوچا اور بے ساختہ کہا کہ میں خود کو آپ کے سپرد کرتا ہوں، سرسید سے میرے دوستانہ مراسم تھے اور ایک طویل عرصہ سے میں ان کے رابطہ میں تھا۔ ان کے مختلف ادبی اور تصنیفی کاموں میں شریک بھی رہا۔ لہٰذا میں نے سرسید کی سوانح مکمل کرنے کا عزم مصمم کر لیا اور نتیجہ کے طور پر Life & Work of Sir Syed Ahmad Khan'' شائع ہو کر منظر عام پر آ گئی۔''

الطاف حسین حالؔی نے '' حیات جاوید'' کے عنوان سے سرسید کی سوانح ترتیب دی تھی لیکن بعض مقامات کو حیاتِ جاوید پر تاثراتی نوعیت کی سوانح ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ لیکن گراہم کی سوانح سرسید کی سماجی زندگی کی سچی ترجمان ہے۔

Colonel George Farquhar living Graham(G.F.I. Graham) ۳ر دسمبر ۱۸۴۰ء کو پیدا ہوا جو نسلاً ایک Scotish کا بیٹا تھا۔ اپنی ماں کی

خواہش پر ۱۸۵۶ء میں بنگال انفنیٹری میں بحیثیت کیڈٹ ہندوستانی سروسز سے وابستہ ہوگیا۔ گراہم نے کلاسیکی ادب اور علم ریاضی کا باضابطہ عمیق مطالعہ کیا بعدازاں گراہم کو "Meroving Institute" جرمنی بھیج دیا گیا جہاں اس نے فرانسیسی اور جرمنی زبانوں پر دسترس حاصل کی۔ گراہم پہلا کمیشن آفیسر تھا جس نے ۱۸۵۶ء میں North Western Province یعنی موجودہ Uttar Pradesh کے شہر ایٹہ میں سپرنٹنڈنٹ آف پولیس (Superinetndent of Police) کے عہدے پر فائز ہوا۔ ان دنوں سرسید احمد خاں بنارس میں اسٹینٹ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۶ء کے درمیان غازی پور میں پہلی بار گراہم سے سرسید کی ملاقات ہوئی۔ بحیثیت پولیس آفیسر گراہم کا بیش تر وقت "North West Province" میں گزرا لیکن حکومت برطانیہ کے اعلیٰ طبقہ (Elite Class) میں اسے کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ اس کی طبیعت میں بہت شرمیلا پن (Shyness) تھا اس نے اپنی بائیس سالہ دور ملازمت میں صرف دو بار عوامی جلسوں سے خطاب کیا:

> ''Graham was only persuaded to speak in public twice in 22 years. At the same time he became fervent supporter of Sir Syed Ahmad Khan''

کرنل گراہم ایک اچھا سوانح نگار اور اسلوب نگار "Stylist" بھی نہیں تھا۔ لیکن سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں سے اسے ذاتی دلچسپی تھی اور وہ انہیں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ غالباً اسی تاثر نے گراہم کو سرسید کی سوانح لکھنے پر آمادہ کیا۔

سرسید پر یہ تاریخی نوعیت کی سوانح ہے جو ایک انگریز نے ایک ہندوستانی مدبر اور دانش ور کے بارے میں قلم بند کی ہے۔ جس سے سرسید سے متعلق بعض اہم

تاریخی واقعات اور سماجی حالات وکوائف کا علم ہوتا ہے۔ لیکن ایک سوال یہ بھی ذہن میں آتا ہے کہ ایک انگریز کو ایک ہندوستانی دانشور سے اس قدر دلچسپی کیوں تھی۔ کیا وہ سرسید کے بارے میں انگریزوں کو معلومات فراہم کرانا چاہتا تھا۔ لیکن گراہم کی اس سوانح میں سرسید سے متعلق آخری دس سالوں کے حالات وکوائف دستیاب نہیں ہو سکے۔ کتاب شائع ہونے کے بعد سرسید کا گراہم سے خط وکتابت کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا تھا۔

ان دنوں سرسید کو کالج کی ناگفتہ صورتحال سے نبرد آزما ہونا پڑ رہا تھا۔

''The establishment of Aligarh College was the grownning of his work and he had to face the keenest oppositin and was threatened with assassination''
(G.F.I.Graham)

البتہ گراہم کی کتاب "Life & Work of Sir Syed Ahmad Khan" ایک Primary Source کے طور پر اس لیے اہم ہو جاتی ہے کہ اس نے سرسید سے متعلق معمولی سے معمولی واقعات کو نہایت سنجیدگی سے قلم بند کیا ہے جو مواد عموماً سرسید سے متعلق دستیاب نہیں ہے۔

بعض خامیوں کے باوجود یہ ایک دلچسپ کتاب ہے۔ جو سرسید سے گہرے مراسم، سچی ذہنی وابستگی اور ان کی شخصیت سے دلچسپی کی بناء پر ضبط تحریر میں آئی۔ Life & Work of Sir Syed Ahmad Khan کے شائع ہونے پر کتاب کی ایک کاپی کرنل گراہم نے سرسید کو ارسال کی۔ کرنل گراہم لکھتا ہے کہ:

With regard to my book on his life, I received the following letter: Allygurg.

24the November, 1885,

"My dear Graham, by the last mail I received a copy of the book which you have called the Life & Work of Sir Syed Ahmad Khan", but which I call the favour of Graham to Syed Ahmed Khan, although the book is well written, is neatly got up, has a good cover, and is a thing to be proud of on acount of its auther, yet the only defect in it is devoted to the life of one like my humble self. The reader cannot help thinking of the followning verse of a persian poet, 'If you combine in you one Good quality and seventy bad ones, your friend will overlook them all and direct his attention to that one good quality. I looked through the book carefully, and turned it all over trying, if I could, to find out any word in it which might give me genuine pleasure and be something to be proud of, and immense was my joy on finding out the followning words in its preface: I have

known syed Ahmad more like a relative, I may say, than a friend. ' I assure you that I shall always feel proud of it the Anglo-Indians. it would be able to realize that such friendship and Sympathy is quite possible between Europeans and the native of India.

However, putting aside the subject of the book, and whether it ought, or ought not, to have been written about an issignificant person like myself, I am glad that you have completed the work on which you had set your heart, and that your labour of love has come time I congratulate myself on the fact that though I did not approve of such a book being written, I have way to the pleasure of one whom I value, not a only as a friend, but as a brother. Remember,dear Grham, I do not mean an elder brother, for I am older than you in you resspect of years, and I acted on the persian saying, It is easy to atone for the breaking of an oath, but it is a mighty wrong to grieve a friend. Herewith I envlose some cutting from tehe 'pioneer'.

containing letters that appeared about one or two points trated of in your book.

we had very heavy rain this year, and as a natural consequence we had a good deal of fever after the rains. I have had fever too, once or twice, but now i am quite well again, and the weather is getting lovely (sic)" syed Mahmud is also here, busy on his work on the Muhamedan law. His leave will expire towars the close of March, when, I think, he is have to go back to his substantial post at Rai Bareli, until a vacancy occurs in the High Court. lord Dufferin will soon be at Agra, where he is going to hold a leve. Sir Syed alfred Lyall asked me to come over to Agra, and I am going by to day's mail. I wish you had been there so that I could then enjoy my visit. I trust this will find you and Mrs. Graham and children well and happy.

with kindest regards for Mrs. Graham and yourself.

Be;oeve me,

Yours ever sincrely

(Sgd.) Syed Ahmed

سرسید کا مذکورہ خط اظہار تشکر بھی ہے اظہار مسرت بھی اور گراہم سے سرسید کی گہری وابستگی نیز روزمرہ کی خبر گیری اور معاملات کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔

۱۸۷۰ء میں public Committee کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی معیار کو بلند کرنا تھا۔ اور خصوصاً مسلمان نوجوانوں میں سیکولر تعلیم (Secular Education) کا احیاء تھا تا کہ وہ نہ صرف حکوم کے ساتھ وفادار ہوں بلکہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی ترقی کے زینے طے کر سکیں ہندوستان میں پہلی بار یہ دیکھا گیا کہ علی گڑھ کالج میں بلاتفریق مذہب وملت اور مسلک ملک کے شمال و جنوب اور مشرق ومغرب یعنی دہلی کے علاوہ بنگال، حیدرآباد اور دور دراز علاقوں سے طلبہ ایک ہی نوع کی تعلیم حاصل کرنے آئے اور سب کا مقصد صرف ایک تھا یعنی اعلیٰ سطح پر حصول تعلیم۔

گراہم اپنی اس کتاب میں لکھتا ہے کہ علی گڑھ کالج دنیا کا پہلا واحد سیکولر تعلیمی ادارہ تھا جہاں کے بنیاد گزاروں نے مختلف مذاہب اور مسلک کے لوگوں کے لیے کالج کے دروازے کھول دیئے تھے۔ ۲۵۹ طلبہ میں ۵۷ ہندو اور تقریبا ایک چوتھائی طلبہ عیسائی اور پارسی تھے جو کالج کے احاطہ میں سیکولر نوعیت کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ Life & Work of sir Syed Ahmad Khan, P: 274۔

At the time of writting my first edition of his lif. Syed Ahmad was alive and well. I then wrote as follows:

"Syed Ahmad has now resided for many

years in his comfortable house in Aligarh, which was purchased and fumished for him in Europen style by his son, the Honble, Syed Mahmud. Here he entertains his numerous guest who visit him from all parts of India Mohammendans, Sikhs, Hindu, and Englishmem. The doors are always open. The whole atmosphere is redolent of literatuer. His sitting of books and papers; the walls of his dining room are covered with bookcases filled with standard English works; and his library a splendid room- is stocked used by him in wrtting his Commenntary on the Bible, Koran, & c. One of the not least interesting books to me is syed Mahmud's prize taken at Cambridge for the best books English essaly! In the drawing- room is the diploma making Syed Ahmed a fellow of thr royal Asiatic Society, of which he is particularly proud, on the wall opposite is a full- lenght protratit in oil his friend Sir john strachey, a

lifelie likeness. There are also portaits of sir Salar jang, lord Lytton, and his Highness the Nizam of Hydrabad. the days for him pass pleasantly and quickly. One of his great chracteeristics is his untiring energy. in additon to great breath of views on questions of nationla importance, he possesses power of work regards minute details which is astonishing. Up at 4 A. M. He writes his newpaper articles, his books and pamphelt sess visitors, offial and private- and conducts the onerous duties of his secretaryship to the College Committees not only by day, but not unfrequently far into the night, withe him mental labour oif the higher kind tends to long life and sound health. His meals are served in European style dinner friends frop in. The topics of conversation range from persian poets and humorous anecdotes. He is of middle height and of massive build, weighing up wards of nineteen stone. His face is

leonine- a rugged witness to his determination and energy. If however, rather sterm and forbidding when at rest, it lights up genially when speaking, reflicting the warmth of heart which he so largely possesses. He has a hearty laugh, and enjoys a joke as much as any man. He will put his stick under the table at dinner. and suddenly frighten those present by pretending to see a anake. Or again, the subject o conversation is the reform of his nation. One of his listenners is sleepy and nods. the Syed is anxious that a ll should attend. The sleepy member says he hears everything, but he presently nods again. All of a sudden a terrific shout ofalarm is heard which makes every one jump, including the sleppy one; but all they see is the old Syed in roars of laughter! He has been a widower for many years, and only had one wife. He informed me the other day, with a twinkle in his eye, that " might marry again! but "

said he, " she must be English, in order that I may mix more freely in English Society, and she must be eighty years old, and have lost all her teeth! " He is a born orator, his delivery, when he warms to his subject, resembles that of Mr. Gladstone. His lips quiver with suppressed emotion; the voice and figurefollow suit, and these evidences audince. He is intnsely cosmopolitain. to substitute "Mohammedan" for" Englishment" ineloquent words used lately in describing the late lord Ampthill: " It is an exceedingly rare thing for an ordinary Mohammedan, even of the better sort, thoroughly to realise the fact, hwever emphatilly he admits the theory, that Mohammendans and other races are of the same flesh and bloood, and are amenvable to the same passions and impulses. It is still rarer to find a Mohammden was no only mptpm;u understands this to be the case, but proves his perception of it in practice.

Syed Ahmed is so him, and rising above all accidental conditions of climate and race, of latitude, longitude, and ethnic idiosyncrasy, he gazes, by dint of his own power of judicious generalisation, upon an imahe which is none other than that of human natuer ttselt. He preserves of patrotism and pride of the stock from which he is sprung, and has divested him- self of all its prejudices." There was not another Mohammedan in India so fitted to take the lead in the great Mohammedan Educational movement as he: no other Mohammedan gentleman possessed the ability, the eloquence, the grat reputation, the comopolitanism, and the intense energy and perseverance of the subject of this sketch, Had. it not been for his great offorts, the Mohammedan would have been far further behind the Hindu community as regard education than it now is; and if the movement with the rapidity which has

hitherto characterised it, the Mohammedans will soom be abreast of the Hindus. amongst the mightly forcesw which have been silently chaning the aspect of affairs in India during the last froty years, Syed Ahmed Khan's name will, to future generations, occupy a conspicuos place.

" I have now traced his honourable and laborious career from his earliest years up to the present, and trust that the pictuer, though very imperfectly drawn, may act as I stimulant to the rising generation of high and distingushed family, but poor, educated only up to his nineteenth year, has raised himself from the lowest rung of the official ladder to the highest, and also educated himself, without the great advantage of a knowledge of English, to become, as he now is, the foremost Mohammedan of his day in India"

گراہم کی یہ تحریر نہایت ہی دلچسپ اور معلومات افزا ہے جو تاریخی نوعیت کے ساتھ ساتھ سرسید کے عزائم مسلک و معاملات اور ذاتی زندگی کے حالات و کوائف کی غماز ہے۔

ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور پریم چند ایک تجزیہ

۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد ہمارا ملک پوری طرح سے برطانوی سامراج کے شکنجے میں آ گیا۔ غیر ملکی نو آبادیاتی حکومت نے معاشی، استحصال کے علاوہ بھی ہندوستانیوں کی زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا تھا۔ مغربی تہذیب کے سیلاب میں ہندوستانیوں کی صدیوں سے پرورش یافتہ تہذیبی سماجی اور اخلاقی قدریں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں اور پوری ایک صدی قدیم وجدید کی کشمکش میں گزری جس کا انجام مغربی صنعتی تہذیب کے غلبہ واقتدار کی شکل میں رونما ہوا انگریزوں نے اپنے نو آبادیاتی نظام کو مستحکم کرنے کے لئے جن تصورات کو فروغ دیا ان میں قومیت کا شعور بھی تھا جو ہندوستان کے حق میں آزادی کی نعمت کا مقدمہ ثابت ہوا۔ ہندوستان میں قومی شعور کی بیداری کے ساتھ جنگِ آزادی میں تیزی اور ہمہ گیری پیدا ہوگئی اور ہندوستانیوں نے انگریزوں کو اپنے ملک سے باہر نکالنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

تحریک آزادی کے فروغ اور قومی شعور کی بیداری میں اردو زبان وادب نے عموماً اور اردو نثر نے خصوصاً ایک اہم اور موثر کردار ادا کیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں قومی نظریات ورجحانات میں تبدیلیاں پیدا ہوگئیں۔ نئی نئی تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ تقسیم بنگال (۱۹۰۵ء) مسلم لیگ کا قیام (۱۹۰۶ء) پہلی جنگ عظیم کا آغاز (۱۹۱۴ء) ہوم رول لیگ کی تحریک (۱۹۱۷ء) خلافت تحریک (۱۹۱۹ء) ان سب تحریکوں کی بدولت یہ دور سیاسی وسماجی اعتبار سے خاصا ہنگامہ خیز تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب پریم چند نے اردو افسانہ نویسی اور ناول نگاری کے میدان میں باضابطہ قدم رکھا۔

پریم چند کا تخلیقی سفر ۱۹۰۱ء سے شروع ہوکر ۱۹۳۶ء میں ختم ہوجاتا ہے۔ اس

مدت میں انہوں نے کم وبیش ایک درجن ناول تخلیق کئے۔ جو اردو کے افسانوی ادب میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ پریم چند کا زمانہ بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا اس وقت سیاسی تحریکیں، اپنے عروج پر تھیں لوگ آزادی کے گیت گا رہے تھے۔ ادھر گاندھی جی ہندوستان کے سیاسی منظر نامے میں اپنا مقام بنا رہے تھے۔ پریم چند گاندھی جی کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ نتیجہ کے طور پر پریم چند نے ملک وقوم کی خدمت کی غرض سے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

پریم چند گاندھی جی سے اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مہاتما گاندھی کے درشنوں کی برکت تھی کہ میرے جیسے مردہ دل آدمی کے دل میں جان آ گئی..... میں نے اپنی بیس سالہ سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔''[۱]

(زمانہ کانپور، پریم چند نمبر ص،۱۷۹)

پریم چند کے صاحبزادے امرت رائے نے لکھا ہے۔

''عملی میدان میں گاندھی جی اور ان کے درمیان استاد اور شاگرد کا رشتہ تھا۔''[۱] (زمانہ کانپور، پریم چند نمبر ص،۱۷۹)

پریم چند اردو کے ایک بڑے ناول نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ وہ محبّ وطن تھے انہیں اپنے وطن کی ہر چیز سے بے پایاں محبت اور لگاؤ تھا ان کے ناول اپنے عہد کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ انہیں وطن سے محبت تھی اس لئے ان کے ناولوں میں حب الوطن کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

دیا نرائن نگم اپنے ایک مضمون میں پریم چند کی حب الوطنی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''وہ سچے محبّ وطن اور کامل ادیب تھے اور فن میں کامل وہی شخص ہوسکتا ہے جس کا دل وسیع، نگاہ بلند، طبیعت بے ریا اور نیت صالح ہو جو زر پرست نہ ہو بلکہ ادنیٰ واعلیٰ ہر ایک کا ہمدرد ہو۔ ہر حال میں

بے لوث رہ کر زندگی کے حقائق سے واقفیت رکھتا ہو۔''[۲]

(زمانہ کانپور، پریم چند نمبر ص،۱۳۱)

حب الوطنی پریم چند کے رگ و ریشہ میں بسی ہوئی تھی۔ عبدالماجد دریابادی نے پریم چند کی وطن دوستی کے بارے میں لکھا ہے۔

''لوگ قصے کہانیوں کو محض لطف و تفریح کے لیے پڑھتے ہیں لیکن اس لطف کے ساتھ اگر نفع بھی منظور ہو تو بدی کی مخفی راہوں کا علم شیطنت کی چالوں کا احساس اور وطن کا صحیح جذبہ ایثار و خلوص اور خدمت خلق کی تربیت بھی اگر مدنظر ہو تو ایسی شیریں خوشگوار کونین پریم چند کے دواخانے میں بھی دستیاب ہوسکتی ہے اور ہندوستان میں تحریک وطنیت کی تاریخ مورخ کا قلم جب آج سے سو پچاس سال کے بعد لکھے گا تو اس کو تمیں پینتیس سال کی تاریخ سمجھنے کے لئے جہاں گاندھی جی۔ موتی لال نہرو، داس، محمد علی، مختار انصاری اور ابوالکلام آزاد کی تقریریں اور تحریریں لازمی ہوں گی۔ وہاں پریم چند کی تحریں بھی ناگزیر ہوں گی۔''

(زمانہ کانپور، پریم چند نمبر ص،۱۶۱)

پریم چند نے اپنی تحریروں اور ناولوں کے ذریعہ آزادی کے نظریات وخیالات کی نمائندگی کے لئے لکھے گئے بالواسطہ طور پر پریم چند نے اپنے ناولوں کے ذریعہ گاندھی جی کے خیالات کو تعلیم یافتہ لوگوں تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پریم چند گاندھی جی کے نظریات سے براہ راست متاثر تھے۔

''جلوۂ ایثار'' میں ایک کردار کی زبان میں لکھتے ہیں:

''مجھے ایک بیٹا دے دیو ماتا

دیا ماتا نے پوچھا جو بہت دھنوان ہو بلوان ہو۔ لیکن ماں نے کہا۔

نہیں مجھے ایسا بیٹا دے جو وطن کی خدمت کرے۔''

زمانہ کانپور، پریم چند نمبر ص،۱۱۰)

پریم چند کے ناولوں میں گوشۂ عافیت ایک اہم ناول ہے۔اس ناول کا زمانۂ تصنیف ۲۳۔۱۹۲۲ء ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان میں عدم تعاون، سول نافرمانی۔کسانوں کی بغاوت اور کمیونسٹ پارٹی کے قیام کا زمانہ تھا۔اس ناول کا مخصوص موضوع کسانوں کی بغاوت ہے جو انگریزی نظام کے خلاف وقتی تقاضوں کے مطابق تھی۔

پریم چند کے ناول'' میدان عمل'' میں اس دور کے ہندوستان کی سیاسی صورت حال اور عوام میں غیر ملکیوں کے خلاف باغیانہ رجحانات کا عکس نظر آتا ہے۔ ''میدان عمل'' کے کردار اس دور کے ہندوستان کی سیاست حکمراں طبقے کے مظالم اور غیر ملکی حکومت کے بیجا تسلط سے نجات کے طلب گار ہیں اور اپنے عہد کی سیاسی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پریم چند کا ایک اور اہم ناول'' چوگان ہستی'' ہے۔جو ۱۹۳۴ء میں تخلیق کیا گیا۔اس کو پریم چند نے اپنا بہترین ناول قرار دیا ہے۔ یہ ناول دو جلدوں میں ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔''چوگان ہستی'' میں پریم چند نے مختلف کرداروں کی زبان سے گاندھی جی کے سیاسی نظریات کی ترجمانی کی ہے۔

''چوگان ہستی'' میں رانی جھانسوی کا کردار بہت اہم ہے وہ اپنے لئے ایک ایسے بیٹے کی خواہش کرتی ہے۔ جو محبّ وطن ہو اور ملک وقوم کی خدمت میں اپنی جان تک قربان کردے وہ ڈنکے کی چوٹ پر تقریر کرتے ہوئے کہتی ہے۔

''میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ ایشور مجھے کوئی ایسا ہی سپوت دینا جو انہیں جنگ بازوں کی طرح موت سے کھیلتا جو اپنی زندگی کو ملک وقوم کی خدمت میں قربان کردیتا ہے۔''[۱] (پریم چند''چوگان ہستی''ص،۱۱۰)

چوگان ہستی''میں آزادی سے قبل کے سماجی معاشی پہلوؤں سے بھی بحث ملتی

ہے اور گاندھی جی کی تحریروں کی جھلک بھی اس ناول میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ گئودان'' پریم چند کا معرکتہ الآرا ناول ہے۔ جس نے نہ صرف اردو بلکہ پورے ہندوستانی ادب میں اپنی اہمیت اور قدر و قیمت کا لوہا منوایا ہے اس ناول میں اس دور کے سیاسی موضوعات اور مسائل سے بحث ملتی ہے۔ گئودان کے کردار آزادی کی تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں۔ اور اپنے وطن سے والہانہ محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔

''گئودان'' کے مندرجہ ذیل اقتباس میں اسی عقیدت اور محبت کی جھلک نظر آتی ہے۔

> ''ممری اور بیلا دونوں صوبہ اودھ کے گاؤں ہیں۔ ضلع کا نام بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ بیلا میں رہتا ہے اور رائے صاحب اگر پال سنگھ ممری، دونوں گاؤں میں صرف پانچ میل کا فاصلہ ہے۔ پچھلی ستیہ گرہ کی لڑائی میں رائے صاحب نے بڑا نام کمایا تھا کونسل کی ممبری چھوڑ کر جیل گئے تھے جبھی سے ان کے علاقے کی اسامیوں کو ان سے بڑی عقیدت ہوگئی تھی۔''

(پریم چند، گئودان ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۷)

پریم چند کی تصانیف پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے بھی حامی تھے۔ انہوں نے عملی طور پر مختلف سیاسی تحریکوں میں حصہ لیا۔ پریم چند نے قلم کی تلوار سے انگریزوں کا مقابلہ کیا اور آخر تک ان کے خلاف نعرۂ احتجاج بلند کرتے رہے۔

موضوعات کے اعتبار سے پریم چند کے ناول دو حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلے قسم کے ناولوں میں معاشرتی حالات اور عقائد کی اصلاح کا عنصر ملتا ہے۔ اور ان میں حب الوطنی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ ان کے اس قسم کے ناولوں میں جلوۂ ایثار، بازار حسن، پردۂ مجاز، وغیرہ شامل ہیں۔ پریم چند کے دوسرے قسم کے ناول موضوعات اور مقصد کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ ان میں معاشرتی مسائل کے ساتھ ساتھ ملک کے سیاسی

اور اقتصادی مسائل کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے پریم چند نے حصول آزادی کو اپنی تحریروں کا مقصد بنایا۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ہاں اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ دوچار بلند پایہ تصنیفیں چھوڑ جاؤں۔ لیکن اس کا مقصد بھی حصول آزادی ہو۔''

اردو میں مختصر افسانے کی روایت زیادہ پرانی نہیں ہے اردو میں افسانہ مغرب کے اثر سے آیا اور بہت کم عرصہ میں نثر کی تقریباً تمام تخلیقی اصناف پر غالب آ گیا اور افسانوی ادب میں مقبول ترین صنف ادب تسلیم کیا جانے لگا۔ اردو افسانے کی تاریخ پریم چند کے بغیر نامکمل نظر آتی ہے۔

''پریم چند افسانے کا رہنما ہے۔ کیونکہ پریم چند نے افسانے کو فن دیا اور اس فن کی تعمیر بھی کی لیکن پریم چند کو افسانے کا موجد کہنا صحیح نہیں۔ پریم چند سے قبل افسانوں کے نمونے مختلف رسائل میں مل جاتے ہیں۔ پریم چند سے قبل جن ادیبوں اور تخلیق کاروں نے مغربی افسانے کے فن اور اس کے تصورات سے ادبی دنیا کو روشناس کرایا ان میں خاص طور پر سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، راشد الخیری، علی محمود بانکی پوری کے نام نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔''

بیسویں صدی کا آغاز ہندوستان میں مختلف سیاسی تحریکیں لے کر آیا رجحانات میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور سیاست نے بھی نیا موڑ لیا۔ ہندوستان کے علاوہ وہ بھی دنیا کے مختلف خطے انتشار اور بے چینی کے عالم میں مبتلا تھے۔ ادھر سیاسی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ ایران، ترکی، اور چین میں بھی یہی صورت حال نظر آتی تھی اسی دوران یعنی ۱۹۱۴ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا جس کا ردعمل یہ ہوا کہ مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آ گئے۔ ادھر نوجوان طبقہ بھی متحرک ہو گیا۔ اس سال ہندو مہاسبھا کی داغ بیل پڑی یہی وہ دور تھا۔ جب پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ ''سوز وطن'' ۱۹۰۸ء میں منظر عام پر آیا۔ سوز وطن میں شامل کہانیوں میں حب الوطنی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اور ان سے

بغاوت کی بو آتی تھی جو انگریزوں کی جابرانہ عملداری کے خلاف تھی۔ لہٰذا حکومت نے اس مجموعہ کو ضبط کرلیا۔ ''سوز وطن'' کی کہانیوں کے بارے میں پریم چند لکھتے ہیں:

''کتاب نکلے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ ایک دن رات کو میں کیمپ میں بیٹھا ہوا تھا کہ کلکٹر صاحب کا (جو انگریز تھے) پروانہ پہنچا کہ فوراً مجھ سے ملو جاڑے کا موسم تھا میں نے بیل گاڑی جتوائی اور راتوں رات تیس چالیس میل کا سفر کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔ ان کے سامنے ''سوز وطن'' کی ایک جلد رکھی ہوئی تھی۔ صاحب نے پوچھا۔ کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے؟ میں نے کہا ہاں۔ صاحب نے ایک کہانی کا مطلب مجھ سے دریافت کیا اور آخر میں بگڑ کر بولے۔''

''تمہاری کہانیوں میں سیڈیشن بھرا ہوا ہے۔ اپنی تقدیر پر خوش ہو کہ انگریز عملداری ہے۔ مغلوں کا راج ہوتا تو تمہارے ہاتھ کاٹ ڈالے جاتے۔ تمہاری کہانیاں یک طرفہ ہیں۔ تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے۔''[۱]

(وقار عظیم مضمون ''پریم چند کے افسانوں کا پہلا مجموعہ'' ص، ۳۲۸)

پریم چند پر باغی ہونے کا الزام لگا دیا گیا۔ اور پابندی لگا دی گئی کہ وہ حکومت اور خصوصاً کلکٹر صاحب کی اجازت کے بغیر کوئی بھی کہانی شائع نہیں کرا سکتے۔

پریم چند ''سوز وطن'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

''ہر ایک قوم کا علم و ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینہ میں صورت، ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور

وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشہ میں متوالے ہو رہے تھے اس زمانے کی یادگار بجز عاشقانہ غزلیں اور چند خیالی کہانیوں کے اور کچھ نہیں دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے جب قوم کے نئے اور پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاح تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے کے قصص وحکایات زیادہ تر اصلاحی اور تجدید کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیالات نے بلوغت کے زینے پر ایک اور قدم بڑھایا اور حب الوطنی کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر ابھارنے لگے۔ کیونکہ ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں جو جوں جوں خیالات وقیع ہوتے جائیں گے اس رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب الوطنی کا نقشہ جمائیں۔''

''سوز وطن'' کے افسانوں سے بغاوت کی بو آتی تھی اور حب الوطنی کے جذبات ابھرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ افسانہ دنیا کا سب سے انمول رتن اس جملہ پر ختم ہوتا ہے۔

''وہ آخری قطرہ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔''

''یہی میرا وطن ہے'' سوز وطن کا تیسرا اور سب سے چھوٹا افسانہ ہے یہ افسانہ ایک ایسے شخص کی حب الوطنی کا مرقع ہے جو ساٹھ برس امریکہ میں آرام وآسائش کی زندگی بسر کر کے اپنے وطن کے دیدار کی تمنا لے کر اپنے پیارے وطن کو واپس آیا ہے۔

پریم چند کے ایسے افسانے جو خصوصاً جنگِ آزادی کے موضوع پر لکھے گئے ان میں ''ڈامل کا قیدی''، ''آخری تحفہ''، قاتل''، ''جلوہ''، ''آشیاں برباد'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

افسانہ ''آخری تحفہ'' کے کردار سرسودیشی اور پکٹنگ کی تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں۔اس میں امرناتھ اور مالتی۔دو اہم کردار ہیں امرناتھ محبّ وطن ہے وہ ان تحریکوں میں زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے اسی طرح افسانہ جیل میں بشمبھر کا کردار زیادہ نمایاں نظر آتا ہے وہ بی۔اے کا طالب علم ہے اور اپنی تعلیم کی پروا کئے بغیر سودیشی تحریک میں کود پڑتا ہے۔روپ متی اس کی جرأت اور حوصلے کو دیکھ کر تعریف کرتی ہے۔

افسانہ ''آشیاں برباد میں'' عورتوں کی جدوجہد آزادی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار ''مرولا'' کی شکل میں پریم چند نے اس عورت کو پیش کیا ہے۔جو ظلم رسیدہ ہونے کے باوجود عالی ہمت اور بلند حوصلہ ہے اور آزادی کی جنگ میں شریک ہے۔اس کا بیٹا، شوہر اور ماں جنگِ آزادی کی لڑائی میں مارے جا چکے ہیں۔اس کے مندرجہ ذیل الفاظ اس کے بلند حوصلہ کو ظاہر کرتے ہیں:۔

> ''.....دکھانا تھا کہ ہم تشدد سے اپنے مطالبۂ آزادی سے دست بردار ہونے والے نہیں.....وہ (حکومت) یہ دکھانا چاہتی تھی کہ ہم تمہارے اوپر حکومت کرنے آئے ہیں اور حکومت کریں گے۔تمہاری خوشی یا ناخوشی کی قوم کو پرواہ بھی نہیں جلوس نکالنے کی ممانعت کردی گئی.....آج کانگریس کی صدارت کا فخر مجھے عطا کیا گیا ہے۔میں اپنے دل میں ایک عجیب طاقت کا احساس کررہی تھی۔ایک کمزور عورت جسے بولنے کا بھی شعور نہیں جس نے کبھی گھر سے قدم نہیں نکالا آج اپنے پیاروں کی قربانیوں کی بدولت اس مرتبہ پر پہنچ گئی تھی جو بڑے سے بڑے سرکاری افسر کو

بھی بڑے سے بڑے مہاراجہ کو بھی حاصل نہیں۔''[۱]

(پریم چند''آشیاں برباد''افسانہ)

دوسری جنگ عظیم کے بعد انگریزوں کے سفاکانہ مظالم نے اور بھی شدت اختیار کر لی۔جلیانوالہ باغ کا سانحہ حکومت کا معاندانہ اور وحشیانہ سلوک ہندوستانیوں کو زندہ اور بیدار کرنے اور ان کے ارادوں کو مصمم بنانے کی فضا پیدا کی سارا ملک آزادی کی لہر میں آ گیا۔مسلمانوں میں اتحاد اور یکجہتی پیدا ہوگئی وطن کی محبت نے کروڑوں عوام کے دلوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔

۱۹۲۹ء میں جب سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ہی اردو کے ادیبوں اور صحافیوں نے اس کا خیر مقدم کیا اخباروں نے مضامین کے ذریعہ اور ادیبوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ آزادی کو بیدار کیا۔

پریم چند نے اپنی تحریروں اور خصوصاً افسانوں کے ذریعہ ملک وقوم کی خدمات انجام دیں انہوں نے افسانہ نگاری کے میدان میں ایسے دور میں قدم رکھا جب ہندوستان سیاست کی آگ میں جل رہا تھا انگریز حکمراں ہندوستان کے عوام کو نیست ونابود کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ملک افراتفری کے عالم میں مبتلا تھا۔حریت پسند اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے اور ان کے خواب پورے ہوتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔پریم چند نے ان تمام موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔انہوں نے گاندھی جی کے سیاسی نظریات کو اپنے افسانوں کے ذریعہ عوام تک پہنچایا۔

☆☆☆

بابرنامہ (تزک بابری) : ایک تاریخی تجزیہ
(ظہیرالدین محمد بابر)

عقلمندی انسان کو فضیلت مآب بنا دیتی ہے۔ ظہیرالدین محمد بابر پادشاہ غازی ایک عقلمند اور دانا انسان تھا اور یہ قول اس کی شخصیت پر صادق آتا ہے۔

ڈاکٹر وی ایس اسمتھ کا خیال ہے:

"Babar is perhaps the most Captivating personality in the Oriental history. He is the most asiatie prince of his age and worth of high place among the so Sovereigns of any age or Country."

بابر ایک بہادر سپاہی، کامیاب حکمراں، شعلہ بیاں خطیب شاعر، تخلیق کار، دانشور اور ایک عظیم شخصیت کا مالک تھا۔ فن سپہ گری میں اسے ماہرانہ قدرت حاصل تھی وہ میدان جنگ کا عظیم مجاہد تھا اور بے خوف وخطر میدان جنگ میں کود جاتا تھا۔ اور اسی میل تک بغیر کسی مدد کے گھوڑے پر دوڑ سکتا تھا۔

'He was a fine fencer, good Archer, and Superb horseman'

بابر نے اپنے قلم اور تلوار کو یکساں طور پر بڑے حکیمانہ اور مدبرانہ انداز میں برتا اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ہمیشہ دوسرے مذاہب کا بے حد احترام کرتا تھا۔

ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی جس نے ہندوستان کا ایک بڑا حصہ فتح کیا اور دہلی کو دارالخلافہ قرار دیا۔ وہ کبھی بھی اپنی شکست سے حوصلہ شکن نہیں ہوا۔ جنگ

کے سخت ترین حالات میں بھی وہ خود کو طاقت ور اور حوصلہ افزا تصور کرتا تھا۔ جنگ لڑنے کے مختلف طریقوں سے بخوبی واقف تھا۔ سپہ گری کا فن اسے ورثہ میں ملا تھا۔

بحیثیت DIPLOMAT بھی اس کا ایک اہم مقام ہے بابر نے بڑی حکمت عملی سے مغل افغان اور ہندستانی اشرافیہ کے درمیان توازن پیدا کیا۔

کھانوا کی لڑائی کے موقع پر جب بابر کی فوج حوصلہ شکن ہونے لگی تو اس نے اپنی فوج کے جانباز سرداروں کو طلب کیا اس موقع پر ایک ولولہ انگیز اور عالمانہ خطبہ دیا ان سے اپیل کی اس طرح اپنے بہادر سپاہیوں کے دلوں میں ہمت، حوصلہ، اور شجاعت کو ایک بار پھر زندہ کر دیا۔ جانباز سپاہی بے خوف وخطر مردانہ وار جنگ میں کود پڑے اور فتحیاب ہوئے۔

بابر ایک لائق بیٹا، مشفق باپ، ایک معتبر دوست، محبت کرنے والا شوہر بابر کے بارے میں بھی واقع ہوا تھا۔ رسک بروک Rusk Brooke ان الفاظ میں اظہار تیار کرتا ہے کہ:

> Babar Possessed these eight fandamental quantities.
> LOFTY JUDGEMENT
> NOBLE EMBITION
> THE ART OF VICTORY
> THE ART OF GOVERNANCE
> THE ART OF CONFERRING PROSPERTY UPON HIS PEOPLE
> THE TALENT OF RULING MILDLY
> THE ABILITY TO WIN THE HEART OF SOLDIERS AND LOVER OF JUSTICE.

بابر نے ہمایوں کو یہ وصیت کی تھی کہ ''کبھی اپنے بھائیوں کے خلاف تلوار نہ اٹھانا اور جنگ نہ کرنا اگر چہ وہ اس کے مستحق ہوں''

بابر ایک عالم بادشاہ تھا۔ ترکی چغتائی زبان پر اسے ماہرانہ قدرت حاصل تھی بابر سے لیکر بہادر شاہ ظفر تک سبھی مغل بادشاہ چغتائی تھے بابر چغتائی زبان بولتا تھا اور اسی زبان میں اس نے تزک بابری یعنی بابر نامہ تحریر کیا تزک بابری، بابر نامہ کے نام سے زیادہ مقبول ہے جو دنیا کی بہترین Memoris میں شمار کی جاتی ہے۔ ترکی کے علاوہ بابر کو عربی اور فارسی پر قدرت حاصل تھی۔ بابر نے پانچ سو اشعار پر مشتمل (ترکی) چغتائی زبان میں اپنا ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا جو اس کا ایک اہم شعری تخلیقی کارنامہ ہے۔

تزک بابری میں بابر نے اپنی یادداشتوں اور تاثرات کو خودنوشت کے طور پر اپنی مادری زبان میں منفرد انداز میں قلم بند کیا ہے جو وقتاً فوقتاً اس نے فرصت کے اوقات میں تحریر کی تھیں۔

بابر کا طرز تحریر نہایت ہی دلکش اور مفکرانہ ہے۔ اس نے اصل موضوع پر براہ راست گفتگو کی ہے وہ طوالت سے قطع نظر مختصر جامع اور معلومات افزا بیان پسند کرتا تھا اسے مدبرانہ اور معیاری زبان لکھنے پر مہارت حاصل تھی۔ بابر نے اپنے ذاتی تاثرات اور افکار و نظریات کو نہایت ہی معروضی اور منصفانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ بابر نامے کو پڑھنے کے بعد ایک رومانی کیفیت اور تازہ کاری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس کی زبان و بیان اور واقعات نہایت دلچسپ ہیں۔ سیاسی اور عسکری حالات کے بیان کے علاوہ بابر نے بعض اہم اور نامور شخصیات کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے جس کو پڑھ کر ایک مثبت خاکہ ذہن میں ابھرتا ہے۔ تزک بابری میں بابر نے دو مختلف تہذیبوں اور علاقوں مثلاً سینٹرل ایشیاء اور ہندوستان کی تاریخ و ثقافت، تہذیب و تمدن اور سیاسی صورت حال کا موازانہ نہایت ہی مصورانہ انداز میں علامتی طور پر بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

بابر نے تزک بابری میں ہندوستان کی آب وہوا، ماحول، زبانوں، موسموں، پرندوں، باغوں، ندی نالوں، چشموں، آبشاروں، فصلوں، پھلوں، پھولوں، شہروں، قصبوں، گلی کوچوں، محلوں، تاریخی عمارتوں، قلعوں، خندقوں، توپ خانوں، چھوٹی بڑی ریاستوں، میناروں مسجدوں، مزاروں، درگاہوں خانقاہوں، صوفیوں، باولیوں، کشتیوں، پرندوں، ہاتھی گھوڑوں، سواریوں، مختلف قسم کے اناجوں، بادشاہوں، راجاؤں، اور نوابوں، میدانی علاقوں، ہندی گنتی، وزن، دنوں، مہینوں، درختوں، لکڑی کے اقسام، شکارگاہوں، جنگلوں، سرداروں، سربراہوں، اور وزیروں کی وفاداریوں کا نہایت ہی دلچسپ اور تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

ظہیرالدین محمد بابر بادشاہ غازی ۱۴ فروری ۱۴۸۳ کو اندجان میں پیدا ہوا۔ ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ کو کابل کے باغ بابر میں تدفین ہوئی۔ بابر ایک خودساختہ انسان تھا۔ ۶/ جون ۱۴۹۴ کو بارہ سال کی عمر میں فرغانہ کا بادشاہ بنا۔ ملک فرغانہ کی تاریخی و جغرافیائی کیفیت کا بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ ملک ازبکوں کے لگاتار حملوں سے ویران ہوگیا تھا اس ملک میں سات قصبے ہیں اور اندجان جو اس کی دارالخلافہ ہے ملک کے بالکل بیچ میں واقع ہے۔ جہاں بے شمار میوہ جات اور غلہ پیدا ہوتا ہے یہاں کے رہنے والے ترک ہیں جو بہت خوبصورت ہیں اور ترکی زبان بولتے ہیں۔

امیر تیمور نے اپنی بیٹی شیخ میرزا کو فرغانہ کی سلطنت عطا کی تھی۔ عمر شیخ مرزا کے پانچ بیٹیاں اور تین بیٹے تولد ہوئے سب سے بڑے بیٹے کا نام ظہیرالدین محمد بابر تھا۔ والدہ کا نام قتلق نگار خانم تھا۔ ۱۰/ جون ۱۴۹۴ کو عمر شیخ کا مرزا کا انتقال ہوگیا۔ اور بابر نے ۱۴۹۷ تک یعنی چند برسوں میں خجند، شیراز اور سمرقند پر قبضہ کرلیا۔ سکندر اعظم نے اس شہر کو بسایا تھا اور امیر تیمور نے سمرقند کو اپنی راجدھانی بنایا تھا۔ اس شہر کو ماوراالنہر بھی کہتے ہیں۔ اس کے مغرب میں فرغانہ اور کاشغر مشرق میں شمال میں تاشقند اور جنوب میں بلخ اور ترمذ میں۔ بابر نے اپنی یادداشت میں اپنے قبضے والے شہروں مثلا

سمرقند، خراسان درخشاں، خجند، غزنی، اندجان، قندھار، قوس نادر، بخارا اور فرغانہ کا مفصل ذکر کیا ہے۔

سمرقند کا بطور خاص ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہے کہ ''سمرقند کے میوے بالخصوص انگور اور خربوزے بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ موسم عموماً سرد رہتا ہے باغات بہت ہرے بھرے اور دلکش ہیں۔ قلعوں، مسجدوں، میناروں، مدرسوں خانقاہوں کی سنگ تراشی بہت خوبصورت ہے''۔ ایک جگہ مسجد لقلقہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس مسجد کے صحن میں پیر مارنے سے لق لق کی آواز آتی ہے۔ اس راز کو کوئی نہیں جان سکا۔ سمرقند ایک خوبصورت شہر ہے دنیا کا بہترین کاغذ سمرقند ہی میں تیار ہوتا ہے۔

بخارا سمرقند سے مغرب میں تیس میل (۵ فرسنگ) کے فاصلے پر واقع ہے مزید لکھتا ہے کہ اپنے استاد میر مولانا قاضی، والدہ اور نانی کے مشورے پر سمرقند سے اندجان کے لئے روانہ ہوا تھا اور کچھ عرصہ میں ایسے حالات پیش آئے کہ یہ دونوں شہر میرے قبضے سے جاتے رہے۔ عائشہ سلطان بیگم جو میرے چچا سلطان احمد مرزا کی بیٹی تھیں ان سے خجند میں شادی ہوئی۔ بابر ۱۴۹۹ء سے ۱۵۰۳ء تک ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ ۱۵۰۳ میں فرغانہ کو خیر باد کہہ دیا اور خراسان کے لئے روانہ ہوا۔ اس نے داڑھی بھی منڈوادی تھی اس وقت بابر کی عمر تیس سال تھی۔

بابر نے کابل کو چوتھی اقلیم کہا ہے کابل تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے ملک کے بیچ واقع ہے اس کے مشرق میں پشاور، کاشغر اور ہندوکش ہے۔ مغرب میں کوہستان، اور شمال میں قندز اور اندراب کا ملک ہے۔ جنوب میں فرمل اور افغانستان ہے۔ یہاں کی آب وہوا معتدل اور نہایت لطیف ہے۔ لیکن فصلیں اچھی نہیں ہوتیں اس علاقہ میں مختلف قومیں آباد ہیں۔ میدانوں میں ترک، گھاٹیوں میں عرب، شہروں اور بعض دیہی علاقوں میں تاجیک اور کچھ مقامات پر پشتوی اور افغان آباد ہیں۔ کابل میں عربی، فارسی، ترکی، افغانی، پشتو، پراچی اور گبری وغیرہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔

غزنی کے حوالے سے بابر ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہے کہ غزنی میں ایک مزار ہے لوگوں نے بتایا کہ اگر یہاں پر کھڑے ہوکر درود پڑھا جائے تو یہ مزار ہلنے لگتا ہے میں نے بذات خود اس قبر کو جا کر دیکھا واقعتاً قبر ہلتی ہوئی محسوس ہوئی مگر تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں کے مجاورں نے بڑی چالاکی سے قبر کے اوپر ایک جال سا بنایا ہے جب وہ جال پر چلتے ہیں تو وہ ہلنے لگتا ہے اور اس کے ہلنے سے قبر بھی ہلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے اس جال کو اکھڑوا کر وہاں ایک گنبد تعمیر کروادیا۔

کابل فتح کرنے کے بعد میرے بعض وفادار سرداروں اورا مراء نے ہندوستان کی جانب سفر کی صلاح دی۔ میں نے احباب کے مشورے پر ہندوستان کا سفر اختیار کیا اور ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کرلیا۔ بابر نے لکھا ہے کہ شعبان کے مہینے میں کابل سے ہندوستان کا رخ کیا ہندوستان کے علاقوں سے واقفیت ہی نہیں تھی گرم ملک ہونے کی وجہ سے بہت کچھ آسان نہیں تھا۔ بابر ہندوستان میں صرف حکومت کے ارادے سے داخل ہوا تھا اس کے علاوہ اس کا کوئی اور منشا یا مقصد نہیں تھا۔

۱۵۱۹ سے ۱۵۲۶ تک بابر نے ہندوستان پر پانچ بار حملے کیے ۱۵۲۶ عیسویں جمعرات کا دن تھا پانی پت کے میدان میں فوجیں جمع ہوگئیں صبح کا وقت تھا، سلطان ابراہیم لودھی کی فوجیں سامنے آتی ہوئیں دکھائی دیں۔ سلطان ابراہیم لودی کی کثیر فوج کو دیکھ کر ہماری فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ میں نے خواجہ مہدی کو ابراہیم لودھی کی فوج پر تیروں سے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ ابراہیم لودی کے پاس ایک لاکھ سپاہی اور ایک ہزار ہاتھی تھے ادھر ہماری فوج میں صرف بارہ ہزار سپاہی تھے۔ لیکن تیروں کے حملے سے ابراہیم لودی کی فوج کا منھ پھیر دیا۔ بعدازاں گھماسان کی جنگ ہوئی۔ غبار ایسا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا تھا۔ سورج ایک نیزہ بلند ہوا ہوگا کہ دشمن ہارنے لگا۔ اور خدا کے فضل سے دوپہر تک سلطان ابراہیم کا لشکر خاک میں مل گیا۔ اور اسے بری طرح شکست ہوئی پانچ ہزار آدمی سلطان ابراہیم کے ساتھ مارے گئے چاروں طرف

میدان جنگ میں لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں ہمارا اندازہ پانچ ہزار سپاہیوں کے مارے جانے کا تھا۔لیکن آگرے میں ہندوستانیوں نے بتایا کہ پچاس ساٹھ ہزار فوج کام آئی۔ ہمارے سردار ہاتھیوں کے غول اور فوجیوں کو پکڑ لائے۔ بابر نے لکھا ہے کہ جب میں ابراہیم کے لشکر میں پہنچا اور خیموں اور ڈیروں کو دیکھا ظہر کا وقت تھا طاہر طبیزی نے ابراہیم کی لاش پڑی ہوئی دیکھی اس نے پہچان لیا اور وہ فوراً ابراہیم کا سر کاٹ کر میرے حضور لے آیا۔ میں نے فوراً ہمایوں اور دوسرے سرداروں کو حکم دیا کہ وہ آگرے پر قبضہ کر کے خزانہ کو ضبط کر لیں۔خواجہ محمد سلطان مرزا اور عادل سلطان مرزا کو حکم دیا کہ وہ دہلی جا کر خزانوں کی حفاظت کریں۔ دوسرے دن فوج کے ساتھ کوس بھر چلنے کے بعد گھوڑوں کو آرام دینے کی غرض سے جمنا کے کنارے پر ڈیرے ڈال دیئے بعد ازاں دہلی میں داخل ہوئے۔حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر حاضری دی بدھ کی رات کو دہلی کے قلعہ کی سیر کی شب گذاری کے بعد صبح حضرت خواجہ قطب الدین کے مزار کی زیارت کی سلطان غیاث الدین بلبن، سلطان علاء الدین خلجی کے مقبروں، عمارتوں، شمسی تالاب، حوض خاص، مقبروں کی سیر کی۔ ولی بیگ کو دہلی کا صوبہ دار اور دوست بیگ کو دہلی کا دیوان مقرر کیا۔اور خزانوں پر مہریں لگا کر ان کے سپرد کر دیں۔ جمعرات کو دہلی سے کوچ کر کے تغلق آباد کے قریب جمنا کے کنارے پر آئے اور جمعہ کے دن یہیں قیام کیا۔مولانا محمود نے شہر جا کر دہلی کی جامع مسجد میں نماز پڑھی میرے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ اور فقیروں کو بہت سی رقم تقسیم کر کے واپس آگئے۔تغلق آباد کی سیر کرتے ہوئے ایک ہفتہ بعد یعنی جمعہ کے دن بائیس رجب کو آگرہ پہنچے اور سلیمان فرملی کے مکان پر قیام کیا۔ ہمایوں اور دیگر سردار پہلے ہی آگرہ پہنچ چکے تھے قلعہ کے لوگ قبضہ دینے پر راضی نہیں تھے ہمایوں نے تاکید کر دی تھی کہ کوئی خزانے کو ہاتھ نہ لگائے اور باہر نہ نکلے، یہ انتظام کر کے آگرہ میں منتظر رہے۔

بکر ماجیت جو گوالیار کا راجہ تھا اور اس کے بزرگوں نے سو برس تک وہاں پر

حکومت کی تھی۔اس کی اولاد نے آگرہ آکر ہمایوں کو بہت سے ہیرے نذر کیے۔ان میں کوہ نور ہیرا بھی شامل تھا۔ ہمایوں یہ کوہ نور ہیرا لیکر میرے حضور حاضر ہوا لیکن یہ ہیرا میں نے ہمایوں کو ہی واپس کر دیا۔

آگرہ کے قلعہ پر ابھی تک لودی فوج اور اس کا خاندان قابض تھا۔قلعہ پر قبضہ دینے سے پہلے انہوں نے کئی شرطیں منوائیں ابراہیم کی ماں کو سات لاکھ روپے نقد اور آگرے سے ایک کوس کے فاصلے پر محل دیا اور اس کے امراء کو جاگیریں وغیرہ تقسیم کیں بعد ازاں محل میں داخل ہوئے۔

کابل فتح کرنے کے بعد ۱۵۰۴ میں ہندوستان کو فتح کرنے کی خواہش تھی بابر نے لکھا ہے کہ کبھی تو میرے بھائیوں کی دشمنی رکاوٹ بنی اور کبھی میرے امراء اور سرداروں نے اجازت نہیں دی۔ بابر نے ہندوستان پر پانچ بار حملے کئے۔اور ۱۵۲۶ میں یعنی پانچویں بار ہندوستان پر فتح حاصل ہوئی۔ ہندوستان پر تین بڑے حملہ آوروں کے نام سامنے آتے ہیں محمود غزنوی، محمد غوری، جنھوں نے ہندوستان پر کافی عرصہ حکومت کی اور تیسرا میں ہوں۔فرق یہ ہے کہ غوری اور غزنوی نے جب ہندوستان پر حملے کیے تو ان کے پاس لاکھوں کی تعداد میں سپاہی تھے اور میری فوج کی کل تعداد بارہ ہزار تھی۔اور ابراہیم لودی جیسے طاقت ور بادشاہ سے میری جنگ تھی۔ میں فتحیاب ہوا اور خدا نے مجھے ہندوستان جیسے وسیع ملک کی بادشاہت عطا کی۔

بابر نے جب ہندوستان پر حملہ کیا اس وقت پانچ مسلمان بادشاہ اور ہندو راجہ حکومت کر رہے تھے۔سلطان شہاب الدین غوری کے زمانے سے فیروز شاہ تغلق کے عہد تک دہلی ملک کی دار الخلافہ رہی۔اور یہیں سے پورے ہندوستان پر حکومت رہی۔ ہندوؤں میں سب سے بڑا راجا رانا سانگا تھا۔

تزک بابری میں ہندوستان کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ۔ ہندوستان دینا کے مشہور ملکوں میں سے ایک ہے۔ جو ہمارے لئے بالکل اجنبی ہے۔اس کے پہاڑ،

جنگل، دریا جانور، پھل پھول ہمارے ملک سے مختلف ہیں۔ یہاں کی زبان اور آب وہوا ہمارے ملک سے میل نہیں کھاتی۔ یہاں کی آب وہوا کابل کی کچھ علاقوں کی طرح گرم ہے۔لیکن جیسے ہی دریائے سندھ کو پار کر کے ہم ملک کے ادھر کے حصے میں داخل ہوتے ہیں ہر چیز مختلف دکھائی دیتی ہے۔

ہندوستان کے شمال میں دریائے سندھ کی دوسری جانب جو پہاڑ ہیں اکثر جگہوں پر لوگ وہاں آباد ہیں۔ یہ پہاڑ کشمیر سے لے کر بنگالہ تک پھیلا ہوا ہے۔اس میں بے شمار گاؤں اور قصبے آباد ہیں جہاں مختلف قومیں رہتی ہیں۔ جتنے شہر اور میدانی علاقے ہندوستان میں ہیں اور کسی ملک میں نہیں ہیں۔ ہندوستانی شہر آپس میں ایک دوسرے سے بہت ملتے ہیں۔اگر یہاں کے لوگ کہیں بسنا چاہتے ہیں تو پہلے کنویں کھودتے ہیں اور تالاب بنا لیتے ہیں۔اور پھر رہنے کا انتظام کرتے ہیں۔

ہندوستان کے جانوروں میں ہاتھی بہت اہم ہے۔نیل گائے بہت خوبصورت اور قابل ذکر ہے۔گینڈا بہت بڑا جانور ہے ہمایوں نے گینڈے کو ہندوستان میں پہلی بار دیکھا تھا۔ ہرنوں میں چھوٹے ہرن کی ایک خاص قسم ہوتی ہے۔مور ہندوستان کا خاص پرندہ ہے۔ مینا بھی ایک پالتو اور خوبصورت پرندہ ہے۔ ہمارے ملک میں ہر سال چار موسم ہوتے ہیں مگر ہندوستان میں صرف تین موسم ہیں یہاں کے مہینے چاند کے مہینے کے وسط سے شروع ہو جاتے ہیں۔

اکتوبر ۱۵۲۶ء کے مطابق ۹۳۳ھ محرم کے مہینے میں میرے یہاں ایک اور بچہ پیدا ہوا جس کا نام میں نے فاروق رکھا۔ میں نے کئی شادیاں کیں۔ بابر نے ہندوستان میں پانچ برس حکومت کی اس کا پورا دور حکومت جنگ وجدل اور اسفار میں گذرا بابر کو زہر دے کر مارنے کی بھی کوشش کی گئی۔

بابر رقمطراز ہے کہ جمعہ کے دن ربیع الاول کی سترہویں تاریخ کو مجھے کھانے میں زہر دیا گیا۔ابراہیم لودھی کے باورچی کو میں نے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا تھا لیکن

ابراہیم لودی کی ماں جنہیں میں بڑے احترام سے بوا کہہ کر پکارتا تھا انہوں نے میرے خلاف سازش کی اور وہ باورچی جوان کے دور حکومت میں ان کے یہاں ملازم تھا اس کے ذریعہ کھانے میں مجھے زہر دلوادیا۔ میری بہت حالت خراب ہوگئی لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں بچ گیا سزا کے طور پر باورچی کی کھال کھچوادی اور ابراہیم لودی کے خاندان کو کامران مرزا کے پاس کابل روانہ کردیا۔

جمادی الثانی کی ۲۳ ویں تاریخ یعنی منگل کا دن تھا بابر اپنی فوج کا معائنہ کررہا تھا اچانک اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ شراب پینا ترک کردی جائے۔ اسی وقت شراب سے توبہ کی اور سونے چاندی کے برتنوں میں رکھی ہوئی شراب پھکوا کر ان برتنوں کو غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کروادیا۔

رانا سانگا سے جنگ کے موقع پر حسن میواتی نے بے وفائی کی اور وہ سانگا سے جاملا۔ بابر نے لکھا ہے کہ میں نے اس موقع پر یہ ارادہ کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے رانا سانگا پر فتح بخش دے تو میں اپنی سلطنت میں ہر قسم کا محصول معاف کردوں گا۔ اور یہ خبر عام کروادی دشمن کی فوج کی زیادہ تعداد دیکھ کر ہماری فوج میں کھلبلی مچ گئی اس موقع پر میں نے اپنے سرداروں کو جمع کر کے ایک جذباتی خطبہ دیا جس سے فوج کے حوصلے بلند ہوگئے بالآخر (۹۳۳ھ) (۱۵۲۷ء) کو فتح نصیب ہوئی اور آگرہ کے تخت پر بیٹھا۔

بابر نے اپنے پانچ سالہ دور حکومت میں ہندوستان کے بیشتر حصوں کو فتح کیا اور ایک وسیع مغلیہ سلطنت کی بنیاد ڈالی بابر نے ہندوستان میں جگہ جگہ مساجد، باولیاں، باغات، بارہ دری اور وغیرہ بنوائیں نہریں کھدوائیں، درخت لگوائے۔ وہ پھلوں میں خصوصاً سیب انگور اور انار کا بہت شوقین تھا لیکن اس کے پورے سفر نامے ہیں آم اور جانوروں میں شیر کا ذکر نہیں ملتا۔

تزک بابری کا فارسی ترجمہ اکبر کے کہنے پر عبدالرحیم خان خاناں نے کیا تھا

عبدالرحیم بیرم خاں کا بیٹا اور اکبر کا وزیر اعظم تھا۔ سنسکرت زبان پر اسے قدرت حاصل تھی۔ رحیم دوکے ہے ہندوستانی ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

بابر نامے کے فارسی نسخے ندوۃ العلماء اور دلی کالج کی لائبریوں میں محفوظ ہیں۔ علاوہ ازیں نیشنل میوزیم میں بھی دستیاب ہے۔

فارسی کے علاوہ دیگر یوروپی زبانوں میں بھی مثلاً انگریزی اور فرانسی میں ترجمے ہوتے رہے ہیں۔ W. H. THACKSTON نے ترکی زبان سے انگریزی میں ترجمہ کیا جو تین جلدوں پر مشتمل ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر یونس جعفری سابق استاد فارسی دلی کالج نے تزک بابری کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا اس ترجمہ کو حسن بیگ نے ۲۰۰۷ء میں کراچی سے شائع کروایا۔ حسن بیگ اسکاٹ لینڈ میں میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے فرغانہ سے آگرہ تک کا سفر انہیں راستوں سے کیا جن راستوں سے بابر گذرا تھا۔ یہ ترجمہ ۳۵۸ صفحات پر مشتمل ہے جسے حسن بیگ نے اپنے حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے۔

علاوہ ابریں یہ ترجمہ ماہنامہ جامعہ کے ۲۰۰۸ کے شماروں میں مسلسل آٹھ شماروں میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر یونس جعفری کو ترجمے پر مہارت حاصل تھی وہ تقریباً بیس سال تک راہ اسلام کے لئے ترجمہ کرتے رہے دانش گاہ تہران نے انہیں D.Litt کی اعزازی ڈگری تفویض کی۔ ۲۰۰۸ء میں ایران کا سب سے بڑا فرابی ایوارڈ صدر ایران کے ہاتھوں ملا۔ وہ ایک درجن کتابوں کے مصنف و مولف ہیں۔ بابر نامہ کا یہ اب تک کا آخری ترجمہ ہے۔

بابر سے لیکر بہادر شاہ ظفر تک جس قدر کتابیں خاندان تیموریہ سے متعلق دستیاب ہیں۔ ان سبھی کے تراجم ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں ان تراجم میں ہمایوں نامہ، شاہجہاں نامہ، اکبر نامہ، بابر نامہ، اور تزک بابر وغیرہ شامل

ہیں۔

بابر نامۂ اپنے عہد اور خصوصاً ہندوستان کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی ماحولیاتی ادبی لسانی، اور تاریخی واقعات کی ایک مستند، باوقار اور جامع دستاویز ہے جس بابر نے اسے اپنے ذاتی تجربات اور چشم دید واقعات کی بنیاد پر قلم بند کیا تھا۔

☆☆☆

دنیا کا سب سے بڑا الفی، قرآن مجید

ہندوستان کے نقشے پر راجستھان ایک ایسا مردم خیز صوبہ ہے جو اپنی تاریخی، تہذیبی، علمی و ادبی روایات کی عظیم الشان مثال پیش کرتا ہے اسی سرزمین ذہانت آفریں کا ایک شہر بے مثال ٹونک ہے جسے آزادی سے قبل ملک کی نمائندہ اور اہم ریاستوں میں تسلیم کیا جاتا تھا۔

تقسیم ملک کے بعد یہ ریاستیں تاخت و تاراج ہوگئیں اور ملک دو قومی نظریات میں تقسیم ہوگیا گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را'' لیکن جب ہم ریاست ٹونک کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نوابین ٹونک اور والیان ریاست کو ہمیشہ تاریخ وثقافت، علم وادب فن خطاطی، آرٹ اور کلچر سے گہری دلچسپی رہی، ریاست کے نوابین اور اہل دانش اپنی منصبی ذمہ داریوں کے علاوہ اپنا بیشتر وقت شعروادب اور علم وفن کے فروغ وارتقاء میں صرف کرتے تھے۔ والیان ریاست کے ذاتی کتب خانوں میں قدیم مخطوطات کے خطی نسخے اور مختلف النوع موضوعات پر کثیر تعداد میں نادر ونایاب کتب موجود تھیں۔

نواب محمد علی خاں اور نواب سعادت علی خاں کے ذخیرۂ مخطوطات اور کتب کو عطیہ کے طور پر ڈسٹرک لائبریری کے سپرد کردیا گیا۔ بعد ازاں ۱۹۷۸ء میں حکومت راجستھان نے اسے عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (APRI) میں تبدیل کردیا بعد ازاں ۱۹۸۹ء میں حکومت راجستھان نے اس انسٹی ٹیوٹ کو مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے منسوب کردیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد عربی، فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی خوشنما اور دلکش عمارت ٹونک کی دو تاریخی پہاڑوں راسیا اور اناپورنا کے درمیان جے پور سے سو کلومیٹر

جنوب کی جانب ایک خوبصورت وادی میں واقع ہے جہاں ریسرچ اسکالر اور اہل علم و دانش کو تحقیقی کام کرنے کے لئے ہر ممکنہ سہولیات فراہم کرائی جاتی ہیں۔

یہ ادارہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بین الاقوامی سطح پر اپنی ایک منفرد شناخت رکھتا ہے۔

APRI ٹونک میں مختلف موضوعات پر دستیاب مخطوطات اور نادر کتب کی تعداد اس طرح ہے۔

مخطوطات	:	۸،۵۷۳
مطبوعہ موضوعات کتب	:	۳۱،۴۵۲ (مختلف موضوعات پر)
فرامین	:	۷۱۹
میگزین اور جرنلز	:	۷۷۱۰ (مختلف زبانوں میں)

علاوہ ازیں ریاست ٹونک سے متعلق Judgement اور شرعیہ ریکارڈ ۶۵۰۰۰ دستاویزات پر مشتمل ہے۔ اسناد اور نادر طغروں کے بہترین شاہکار نمونے خاطر خواہ تعداد میں محفوظ ہیں۔ ادارہ کے تحت ۱۹۸۰ سے اب تک ۲۶ سالانہ مجلّے شائع ہو چکے ہیں نیز انسٹی ٹیوٹ کے تحت مطبوعہ کتابوں کی تعداد سو کے قریب ہے۔ جن میں ۶۱ کتابیں اردو میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔

پانچویں صدی ہجری اور اس کے بعد بھی اور اصل نسخے ان کے ترجمے اور کتبوں کا رکارڈ نہایت ہی اہتمام اور سلیقے سے محفوظ کیا گیا ہے۔ ان میں فلسفہ، تصوف، ادب، سیرت وسوانح، سائنس، علم نجوم ادویات، ملفوظات، قرآن وحدیث اور فقہ قابل ذکر ہیں فرامین، قدیم سکے، ٹکٹ (STAMPS) ملبوسات، اور یادگار فوٹو گراف نیز چاول کے دانوان پر لکھی ہوئی قرآنی آیات اور دیگر ANTIQUES کا وافر ذخیرہ انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ ہے۔

اردو کے معروف محقق محمود شیرانی (پنجاب میں اردو) نے بھی ٹونک میں جنم

لیا۔ اردو کے مشہور ادیب عزیز اللہ شیرانی کا اسی سرزمین سے تعلق ہے۔ مشہور مزاح نگار مشتاق یوسفی بھی سرزمین ٹونک ہے۔

۳۰ر جنوری ۱۹۱۴ء کو اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز، شعبۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند سولن ہماچل پردیش کی جانب سے بحیثیت کوآرڈنیٹر اردو طلبہ کے ایک وفد کے ساتھ خاکسار کو ایک تعلیمی دورے پر APRI TONK جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں دنیا کا سب سے بڑا الفی قران مجید دیکھنے کی سعادت میسر آئی۔

اس قرآن مجید کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس کی ہر سطر ترتیب کے اعتبار سے ''الف'' سے شروع ہوتی ہے۔ اسی لئے قرآن کا یہ نسخہ دنیا کا سب سے بڑا الفی قرآن مجید تسلیم کیا گیا ہے۔ جو مولانا ابوالکلام آزاد عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک میں موجود ہے۔ اور یہ سعادت ہندوستان کے حصے میں آئی۔

ضلع چتوڑ راجستھان کے ایک مرد مجاہد اور پاک طینت شخص الحاج محمد شیر خان نے گزشتہ دو برسوں میں قرآن کریم کے اس نادر نسخے کو بڑے اہتمام اور ذوق و شوق کے ساتھ اپنی نگرانی میں تیار کروایا ہے اس کی کتابت، جلد سازی، اور تزئین کاری میں متعدد معتبر افراد نے اپنی خدمات پیش کیں۔ فنِ خطاطی کے ماہر غلام احمد ٹونکی نے اس کی کتابت کرتے وقت اپنے فن کے اعلیٰ نمونے پیش کیے مولانا جمیل احمد کی دیکھ ریکھ اور نگرانی میں یہ عظیم کارنامہ بحسن وخوبی پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ڈیڑھ سال اس کی کتابت اور چھ ماہ جلد سازی میں صرف ہوئے۔ یعنی جلد سازی کے ماہرین سلیم احمد اور رشید بیگ نے اس بیش بہا نسخے کی جلد بندی چھ ماہ میں مکمل کی۔ اس طرح پورے دو سال اس نسخے کی تکمیل میں لگ گئے۔

قرآن کی حواشی کی تزئین کاری بڑی دیدہ زیب اور جاذب نظر ہے۔ مطیع اللہ ظفر اقبال اور ظہور صاحبان نے اس کی تزئین کاری میں اپنی بیش قیمت خدمات

پیش کیں بڑی دلچسپی اور وہ دیدہ ریزی کے ساتھ اسے سجایا اور سنورا ہے۔

قرآن کے اس نسخے کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس کی لمبائی دس فٹ اور پانچ انچ اور چوڑائی سات فٹ اور پانچ انچ ہے۔یعنی ("10' 5" x 7' 5") ہے اسی لیے دنیا کا سب سے بڑا الفی قرآن پاک تسلیم کیا جارہا ہے۔جو سائز کے اعتبار سے بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا۔اس کی رنگ خوش نویسی، تزئین کاری، دلکش نقش ونگاری بے مثال ہے ہندوستان کے علاوہ خط نسخ میں اتنے برے سائز کا الفی قرآن مجید ابھی تک کسی اسلامی یا غیر اسلامی ملک میں دستیاب نہیں ہے۔

کاغذ کی درستگی، سطور کشی، ٹریسنگ اور صفائی کو حافظ محمد اویس، انور، خالق، راغب اور کامران صاحبان نے بڑی دیدہ ریزی اور انہماک سے انجام دیا ہے۔

قرآن کے اس نسخے کے کاغذ کو سانگانیری جے پور کے ماہرین نے خصوصی توجہ کے ساتھ تیار کیا ہے۔یہ ہینڈ میڈ ہے اور اسے سانگانیری کاغذ کہا جاتا ہے۔کاغذ کے ماہرین کے مطابق اس نسخے کا کاغذ چار سو سال تک محفوظ رہ سکتا ہے۔

کاغذ کی آٹھ شیٹیں جوڑ کر ایک ورق تیار کیا گیا ہے 3MM کے قلم سے نہایت ہی دلکش اور خوشنما انداز میں لکھا گیا ہے مسطر ۴۱ سطر پر روشنائی روٹرنگ (Rotring) یعنی میڈ ان جرمنی ہے۔

قرآن کے اس نسخے کا وزن ۲۶۰ کلو گرام ہے۔ چوبیس اوراق اور ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

ہر صفحہ کے نقش ونگار دوسرے صفحے سے بالکل مختلف اور فنی اعتبار سے ممتاز ہیں۔جلد پر اعلیٰ قسم کی نقاشی کی گئی ہے اور جلد کے چاروں گوشوں پر چاندی کے منقش کونے بنا کر بڑی خوبصورتی کے ساتھ نصب کیے گئے ہیں۔

چاندی کی ایک تختی پر سونے کا پالش کروا کر شیر محمد خاں جن کا یہ بے مثال کارنامہ ہے اور کاتب غلام احمد کے اسم گرامی کندہ کر کے جلد پر نصب کر دیا گیا ہے۔

قرآن کریم کے اس نادر و نایاب نسخے کو دیکھنے کے لئے نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر ممالک سے بھی سے شائقین جوق در جوق راجستھان APRI ٹونک راجستھان پہنچ رہے ہیں۔قرآن کے اس الفی نسخے کو GUNNESS BOOK OF WORLD RECORD میں شامل کیے جانے کی شفارش کی ہے۔اس سلسلے میں کوششیں جاری ہیں۔امید ہے کہ جلد ہی اس نادر نسخے کو GUINNESS BOOK OF WORLD RECORD میں شامل کرلیا جائے گا۔ اور یہ سعادت الحاج محمد شیر خاں کے ذریعہ APRI ٹونک کے حصہّ میں آئی ہے۔مزید تفصیلات کے لیے اس خطی نسخے کا نادر نمونہ APRI ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔

☆☆☆

اقبال سہیل کی مرثیہ نگاری

سرزمینِ اعظم گڑھ نے بھی کیسی کیسی نادر و نایاب شخصیتوں کو جنم دیا جن کے ذکر کے بغیر اردو زبان و ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی اسی سرزمین بے مثال کی ایک نابغۂ روزگار کا شخصیت اقبال سہیل بھی تھے جنہوں نے ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کیے بغیر اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اردو شعر و ادب کی آبیاری میں صرف کر دیا اور ان کے فن پارے وقت کی گرد میں دب کر رہ گئے ناقدین ادب نے بھی سہیل کے تخلیقی پاروں کو لائق اعتنا نہیں سمجھا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس باکمال دانشور اور تخلیقی فن کار نے شاعری کو محض شوق کے طور پر برتا لیکن پیشہ کبھی قرار نہیں دیا۔

اساتذہ کی صحبت اور خطۂ اعظم گڑھ کے علمی و ادبی ماحول نے سہیل کے ذوق شعری کو اور بھی جلا بخشی اس طرح خطۂ اعظم گڑھ کا یہ عظیم تخلیقی فن کار افق شاعری پر نیّر اعظم بن کر چمک اٹھا۔

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے

''سہیل کے جمال فن اور معنی روشن کے فیض سے بزم سخن کا کوئی گوشہ محروم نہیں ان کی غزلیں ان کی نظمیں، ان کے قطعات، ان کے مرثیے، ان کے قصائد نعت و منقبت، سہرے اور رباعیات سبھی ان کی سحر طرازیوں کے دلکش نمونے ہیں۔''

سہیل نے تقریباً ہر ہیئت مثلاً مربع مخمس، مسدس، مثنوی، مسمط اور ترجیع بند وغیرہ میں تجربے کیے فن اور تخلیقی توانائی کے خوب جوہر دکھائے۔

سہیل نے سب سے زیادہ صنف غزل میں طبع آزمائی کی۔ کلیات سہیل میں غزلوں کی تعداد ۴۷ ہے جبکہ ۴۰ نظمیں ہیں ان میں ۱۹ نظمیں تحریک آزادی، حب الوطنی اور قومی یکجہتی سے متعلق ہیں۔ دس قصائد ہیں جن میں پانچ منقبت اور پانچ نعت کی ہیت میں ہیں۔ سہیل کی گیارہ رباعیاں ہیں ایک فارسی اور دس اردو میں۔ قطعات کی تعداد آٹھ ہے جن میں چھ فارسی اور اردو میں ہیں۔

سہیل کے آٹھ فرمائشی سہرے بھی ملتے ہیں ان میں چھ مخمس کی ہیت میں ہیں ایک شہر آشوب اور ایک سہرا غزل کی ہیت میں ملتا ہے۔

سہیل نے اردو فارسی دونوں زبانوں میں شخصی نوعیت کے مرثیے کہے ہیں۔ فارسی مرثیوں میں استاد علامہ شبلی، نوحہ دیگر بتقریب یوم شبلی اور مرثیہ مصطفیٰ کمال پاشا قابل ذکر ہیں۔ اردو مرثیوں میں مرگِ حیات آفریں (محمد علی جوہر) اور گاندھی جی اہم ہیں اقبال سہیل نے اپنے ایک اور مرثیہ کا ذکر تبصرہ پر نوائے حیات'' میں بھی کیا ہے یہ مرثیہ کلیات سہیل میں شامل نہیں ہے۔ سہیل نے یہ مرثیہ اپنے ماموں جان کی وفات پر کہا تھا۔

افتخار اعظمی اپنی کتاب تابش سہیل میں لکھتے ہیں کہ:

> ''وہ خود بھی اس کا ذکر کیا کرتے تھے اس مرثیہ کے صرف دو چار شعر ہی انہیں یاد رہ گئے تھے۔ شبلی نے اس کی بے حد داد دی تھی۔''

اقبال سہیل خود اس کے بارے میں فرماتے ہیں۔

> ''مولانا شبلی نے اس مرثیہ کی حد سے زیادہ داد دی اور میری موزوں طبعی اور ذوق فارسی پر اظہار مسرت فرمایا اور یہ بھی ارشاد ہوا کہ تیری شاعری پر مجھکو خود اپنے کلام کا دھوکہ ہو رہا تھا۔''

سہیل کا بہت سا کلام مختلف اصناف کے حوالے سے ضبط تحریر میں نہیں آسکا

اور ضایع ہو گیا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ اردو میں سہیل کے صرف دو ہی مرثیے دستیاب ہو سکے ہیں جو کلیات سہیل میں شامل ہیں پہلا مرثیہ ''مرگ حیات آفریں'' جو مولانا محمد علی جوہر کا مرثیہ ہے ۲۳ بندوں پر مشتمل یہ طویل مرثیہ مخمس کی ہیت میں ہے۔

اردو میں شخصی مرثیوں کی روایت بھی خاصی پرانی ہو چکی ہے ان میں علامہ اقبال، حالی، جوش، نسیم امروہوی، وحید ہاشمی، فراق اور چکبست کے نام خاص طور پر سامنے آتے ہیں۔ علامہ اقبال کی ایک نظم شبلی اور حالی اسی نوع کی ایک مثال ہے۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

خاموش ہو گئے، چمنستاں کے زاردار
سرمایۂ گذار تھی، جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے، ابھی اہل گلستاں
حالی بھی ہو گیا، سوئے فردوس رہ نورد

سہیل نے شخصی مرثیہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا اگر چہ یہ مرثیے ان کی ذاتی عقیدت بھی ہو سکتی ہے ''مرگ حیات آفریں'' میں وہ ابتدائی بند میں دنیا کی کشمکش اور سراسیمگی کو نہایت ہی فلسفیانہ اور حکیمانہ انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا سیر و تفریح کی جگہ نہیں بلکہ یہ زہر کی تاثیر رکھتی ہے۔ یعنی زندگی اور موت میں جام و سنگ کا تعلق ہے اس دنیائے فانی میں جو بھی آیا وہ وقت اور آلام و مصائب سے انسان موت سے پہلے نجات نہیں پا سکا۔ سہیل نے دنیا کے پر پیچ حالات کو زندگی کی بھول بھلیوں سے تعبیر کیا ہے چند اشعار مثال کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔

موت سے پہلے کہاں اس سے میسر نجات
بھول بھلیاں ہے یہ دام گہہ شش جہات
کر نہی سکا کوئی حل، مسئلہ کائنات

شاطر ایام سے کھائی نہیں کس نے مات
اس کا گرفتار دام چھوٹ کر نکلا نہیں

زندگی فانی ہے جو ایک قوس قزح کی طرح ہے دنیا کا نظام عقل وفہم سے ماورا ہے اس میں بڑی بے ثباتی اور پائیداری ہے یہاں کی رونقیں بناوٹی اور مصنوعی ہیں دارشکوہ، جمشید اور زار جیسی نامور ہستیاں اس دنیائے فانی سے نیست و نابود ہوگئیں۔

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

سہیل خود سے سرگوشی کے انداز میں اس طرح مخاطب ہوتے ہیں کہ دنیا کی حقیقت ایک سراب کی سی ہے اور اس کی مثال بھی نقش آب کی سی ہے۔ جس طرح نقش آب اور سراب فنا سے تعبیر ہیں انسانی زندگی کا وجود بھی انہیں خصوصیات سے ماخوذ ہے۔ چند اشعار نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

جلوۂ ہستی ہے کیا صرف فریب سراب
زندگی مستعار، کیا ہے بس اک نقش آب
اس کی حقیقت عدم، اس کا وجود اضطراب
خواب ہے یہ زندگی موت ہے تعبیر خواب
زندگی اک وہم ہے موت ہے حق الیقین

ان اشعار میں سہیل نے فلسفۂ حیات و ممات کی بہترین منظر کشی (PANORAMIC DESCRIPTION) کی ہے۔ اور یہاں سے مرثیہ ایک نیا موڑ لیتا ہے۔ یعنی وہی حیات جاوداں کا جام پیتا ہے جس نے اپنی زندگی کو عشق کی پرخطر راہوں میں قربان کر دیا ہو ملک وملت پر جان نچھاور کرنے والا حق و صداقت کا پرستار عظیم مجاہد آزادی، شہید وفا کی شہادت پر آہ وفغاں کرنا شہادت کی

توہین ہے اور اس عظیم شہید کی کسر شان بھی، وہ تو زندۂ جاوید ہے اور پھر سہیل کا روئے سخن محمد علی جوہر کی جانب مبذول ہوتا ہے۔ محمد علی جوہر کی وفات حسرت آیات یعنی وطن چھوڑنے پر اضمحلال کی کیفیت کے بجائے وہ سیر بہشت کی مبارک باد پیش کرتے ہیں مرثیہ کا بند ملاحظہ ہو:۔

آہ! محمد علی آہ شہید وطن
زبدۂ اہل کمال، مرجع ارباب فن
چھوڑ کر تو چل دیا دہر کا دارالمحن
ملتِ مرحوم کی سونی ہوئی انجمن
خیر مبارک تجھے سیر بہشت بریں

مولانا محمد علی جوہر کی وفات فلسطین میں ہوئی اور قبر بیت المقدس میں ہے۔ یعنی مشرق کا سورج مغرب میں غروب ہوگیا جس کی شخصیت ملک و ملت کے لیے منارہ نور اور روشنی کا منبع تھی۔ ان کی شہادت پر کائنات کی ہر شے مغموم ہے۔ سہیل کی تخلیقی بلند خیالی اور ندرتِ ادا کا اندازہ اس بند سے لگایا جا سکتا ہے۔

یوں تو ہر اک صبح کو صبح گہ حشر تک
شرق سے ہوگا طلوع شاہ سریر فلک
کیوں نہ ہو محو فغاں آج سماتا سمک
آہ نہ دکھلائے گا اب کبھی اپنی جھلک
غرب میں ڈوبا ہے جو شرق کا مہر مبیں

مہر مبیں کو شاعر نے محمد علی کے لیے استعارے کے طور پر برتا ہے یعنی محمد علی کی ذات بڑی اعلیٰ صفات اور ہمہ جہت تھی وہ ایک شعلہ بیاں خطیب بھی تھے۔ سہیل جوہر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی شخصی خوبیوں کی وجہ سے ان کی شہرت اور مقبولیت شرق سے غرب اور غرب سے عجم تک پھیلی ہوئی تھی یہ ان کی نیکیوں

اور لوگوں کی دعاؤں کا ہی نتیجہ تھا کہ محمد علی کی تدفین بیت المقدس جیسی مقدس سرزمین میں ہوئی۔

اقبال سہیل نے اپنے فن کمال سے مرثیہ میں موسیقی اور غنائیت کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ مرثیہ استعاراتی زبان میں فلسفیانہ انداز شعریات کا سیل بے پناہ امڈتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جو قربانیوں میں یقین رکھتا ہے وہی زور طوفان سے مقابلہ کرنے کی ہمت اور حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ اور اسی کو دنیا میں سربلندی اور آفاقایت میسر آتی ہے۔ بقول شاعر

جو زورِ طوفاں سے لڑ سکے گا اسی کا دنیا میں نام ہوگا
جو اپنی کشتی بچا سکے گا وہی علیہ السلام ہوگا

اردو میں سہیل کا دوسرا مرثیہ گاندھی جی پر ہے۔ یہ مرثیہ غزل کی ہیت میں ۴۲ اشعار پر مشتمل ہے۔ سہیل نے مرثیہ میں گاندھی جی کا براہ راست تو ذکر نہیں کیا۔ البتہ وہ ان کے قتل کی مثال اس طرح دیتے ہیں کہ انہوں نے جن اہل وطن یعنی ہندوستانیوں کو آب حیات پلایا انہیں نے گاندھی جی کو موت کا جام دیا۔ یہاں سے ذہن گاندھی جی کی طرف جاتا ہے۔

وہ فروغ بخش ہر انجمن کہ زمانے بھر میں تھا ضوفگن
وہ چراغ بزم گہ وطن کسی تیرہ دل نے بجھا دیا
وہ خمیدہ قد، خیم ماہِ نور وہ نظر فریب خنک سی ضو
وہ نگاہ برق عمل کی رو کہ دلوں کو جس نے ملا دیا

مرثیہ کے آخری بند میں سہیل نے گاندھی جی کی خدمات اور اعلیٰ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی زندگی مشعل راہ تھی سہیل گاندھی جی کو عیسیٰ کا تتبع، بودھ اور کرشن کا جانشین تصور کرتے ہوئے اس طرح اظہار کرتے ہیں کہ ان کے قاتل انہیں قتل کر کے جشن نہ منائیں وہ تو کروڑوں لوگوں کے دلوں کی تھے اور بلا

تفریق مذہب وملت ان کی زندگی خود تو پرسوز اور مغموم تھی لیکن زمانے کے لئے روشنی کا سرچشمہ اور منبع ثابت ہوئی۔ گاندھی جی کے جسد خاکی کو پھول سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح شمع کی لو گل ہو جانے کے بعد پھول کی طرح ہو جاتی ہے اسی طرح ان کا جسم آگ میں جلنے کے بعد پھول کی مانند ہو گیا۔

عربی، فارسی تراکیب اور قافیوں کے برمحل استعمال سے مرثیہ میں فصاحت اور نغمگی پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً عروس کشور ہند، ژالال چشمۂ آگہی، صید سلسلۂ کرم اور قتیل خنجر صبر وحق جیسی تراکیب نے گاندھی جی کی شخصیت کو مزید عظمت عطا کی ہے۔

سہیل کے دونوں ہی مرثیہ فنی اعتبار سے بڑے معیاری اور منفرد ہیں جو اردو میں شخصی مرثیہ نگاری کی تاریخ میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

باغ گیتی میں نہ ہوگا اب کوئی پیدا سہیل
غیر ممکن ہے کرے خاک وطن پیدا سہیل

نظیر کے کلام میں مقامی رنگ فکر و فلسفہ کے حوالے سے

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں یہ عام روایت رہی ہے کہ عموماً بڑے فن کاروں کو ان کے جیتے جی وہ پذیرائی میسر نہیں آئی جس کے وہ مستحق تھے بعد از مرگ ارباب تلاش ان کے فن پاروں کو جمع کرتے ہیں اور ناقدین و محققین ان کے کلام کی تفہیم و تحسین کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں لیکن برسوں بعد بھی اس کام کی تکمیل نہیں ہو پاتی اس نوع کے حالات سے نظیر کو بھی دوچار ہونا پڑا اور برسوں تک انہیں بازاری اور عامیانہ نوعیت کا شاعر سمجھا جاتا رہا۔ نظیر کا نام آتے ہی ایک سوال جو ذہن میں آتا ہے وہ ان کی گمنامی اور عدم وجود کا مسئلہ ہے۔

نظیر کی شاعری اگر چہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ کو محیط ہے لیکن اردو کا کوئی بھی بڑا شاعر یا فن کار اتنا گمنام نہیں گذرا جس کے ساتھ اس قدر حق تلفی اور نا انصافی روا رکھی گئی ہو۔ ناقدین نے بھی انہیں کبھی لائق اعتنا نہیں سمجھا اور وہ ان کی معیاری شاعری سے بے خبر رہے۔ البتہ گذشتہ نصف صدی سے نظیر کے کلام کی تلاش و جستجو اور تفہیم و تحقیق کا سلسلہ شروع ہوا ہے بایں ہمہ ان پر تحقیقی اور تنقیدی کتابوں کی تعداد بہت کم ہے اور ابھی تک نظیر کی شعری عظمت کا اعتراف اس سطح پر نہیں ہوا جس کے وہ مستحق ہیں۔

نظیر کی گمنامی کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ وہ غیر ستائش پسند، دیانتدار، صاف گو اور خاموش طبع واقع ہوئے تھے وہ سماج کے اعلیٰ طبقہ سے الگ تھلگ عام لوگوں میں بیٹھنا پسند کرتے تھے اور انہیں کی فرمائش پر شعر بھی کہتے تھے وہ کبھی کسی دربار سے وظیفہ یاب بھی نہیں ہوئے نظیر کا خیال تھا کہ شعر ذوقی اور وجدانی کیفیات کا نتیجہ ہوتا ہے جو

دل کی گہرائیوں اور تحریک سے ظہور پذیر ہوسکتا ہے نہ کہ رؤسا کی فرمائشوں اور حصول زر کی خواہش سے۔

محمد حسین آزاد کے تذکرۂ ''آب حیات'' میں نظیر پر خاطر خواہ بحث نہیں ملتی جو ایک سوالیہ نشان ہے۔ گمان غالب ہے کہ محمد حسین آزاد نے نظیر کے کلام کا بہ نظر غائر مطالعہ ہی نہیں کیا غالباً وہ بھی نظیر کو اعلیٰ درجہ کا شاعر نہ سمجھ کر عامیانہ اور بازاری نوعیت کے شاعر سمجھتے رہے۔

عام طور پر ارباب نظر کا یہ خیال ہے کہ نظیر عوامی شاعر ہے خاکسار کو اہل ادب کے اس نظریے سے قدرے اختلاف ہے کیونکہ نظیر جیسے بڑے شاعر کو صرف عوامی شاعر کہہ دینا اس کے معیار کی نفی کرتا ہے۔

پہلے تو ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ عوامی شاعر کسے کہتے ہیں اس کی تعریف یعنی (Defintion) کیا ہے۔ عوامی اور غیر عوامی شاعری کو کس طرح دو شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اردو کے دیگر بڑے شعرا کے یہاں بھی عوامی موضوعات پر بے شمار نظمیں موجود ہیں لیکن نظیر کا کمال یہ ہے کہ وہ عام فہم اور مقامی رنگ میں ڈوبے ہوئے موضوعات پر زندگی کے فکر و فلسفہ کو جس انداز میں دیکھتے ہیں۔ دوسرے شعرا کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی۔ نظیر کی بے شمار نظمیں اس نوع کی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ مثلاً نظم ہنس نامہ میں فلسفۂ حیات و ممات کی سچی تصویر اس طرح پیش کی ہے۔

سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیر آہ
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

نظیر کا درویشانہ اور قلندرانہ انداز ان کی شعری اور تخلیقی کائنات پر ہمشہ حاوی رہا۔ کیونکہ نظیر کی شاعری کا معیار مقامی رنگ میں فلسفیانہ اور مدبرانہ نظر آتا ہے۔ ان کا اسلوب اردو کے دیگر شعراء سے بالکل مختلف ہے۔

نظیر برصغیر کا ایک ایسا منفرد شاعر ہے جس نے مروجہ زبان کے تقاضوں

سے قطع نظر ایک ایسی زبان کو تلاش کیا جو عوام میں نہ صرف مقبول ہو سکے بلکہ عام فہم اور سادہ سلیس زبان کے ذریعہ گہرے فکر و فلسفہ کا اظہار بھی ممکن ہو سکے۔ نظیر کی شاعری مقامی کلچر، تہذیب و تمدن اور ہندوستان کے مشترکہ ثقافت کی نمائندگی کرتی ہے۔ مقامی رنگ اور دلفریباں ہمشہ نظیر کی ترجیحات میں شامل رہیں۔ جو لسانی یکجہتی باہمی یگانگت کی منفرد مثال پیش کرتی ہیں۔ فارسی، عربی اور ترکی زبانوں کو وہ غیر ملکی زبانیں تصور کرتے تھے۔ نظیر تصوراتی اور تخیلاتی مناظر سے لطف اندوز نہیں ہوتے بلکہ وہ ہندوستانی مناظر، میلوں، موسموں، تہواروں اور پرندوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ان کا نقشہ بجنسہ نظم کرتے ہیں۔ جس کے ذریعہ وہ روحانی لطف و کیف محسوس کرتے ہیں۔ پپیہے کی آہ وزاری، طوطا مینا کے دلکش ترانے نظیر کو طرح طرح سے لبھاتے ہیں۔ ہندوستانی پھولوں کی خوشبوئیں اور عطر پاشیاں ان کے دماغ کو ہر وقت معطر اور ہر لمحہ بشاش رکھتی ہیں۔ نظیر کی اردو میں اصطلاحات مرکبات کا موجد بھی کہا جاتا ہے۔

نظیر ہر مذہب وملت اور ہر طبقہ کی معاشرت سے بخوبی واقف تھے۔ ہندوستانی رسم ورواج میلے ٹھیلوں کی رنگ رلیاں، تاریخ وثقافت اور تہذیب وتمدن کے نقطۂ نظر سے نظیر کا کلام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

یکسانیت، بے تعصبی، جذبات کا توازن نظیر کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ مثلاً ایک مصرعہ میں مندر کا ذکر ہے تو دوسرے مصرعہ میں مسجد کا تذکرہ ہے۔

ہندوستانی رنگ اور عوامی زبان میں نظیر کے کلام کا ایک بڑا حصہ فکر و فلسفہ اور تصوف کی بہترین مثالیں پیش کرتا ہے۔ ٹیگور کے یہاں ایک ہی بات کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ یہ التزام عام طور پر نظیر کے کلام میں بھی موجود ہے نظیر کا بہت سا کلام تو ضایع ہو گیا اور پورا کلام شائع بھی نہیں ہو سکا۔ نظیر کی بے شمار نظمیں ایسی ہیں جو پیشہ وروں، فقیروں اور خوانچے والوں کے پاس رہ گئیں جو ان سے وقتاً فوقتاً فرمائش کے طور پر لکھوا کر لے جایا کرتے تھے۔ نظیر کا یہ کلام جو مترنم بحروں میں ہے حکائی ادب

(Oral Literature) کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ اگر نظیر کی بعض نظموں کو ڈرامے کی شکل دے دی جائے تو کامیاب اسٹیج ڈرامے ثابت ہو سکتے ہیں بعض نظموں سے تو اوپیرا (Opera) یعنی منظوم ڈراموں کا گمان ہوتا ہے۔ نظیر کے کلام میں عوامیت کے ساتھ ساتھ روحانیت، فکر و فلسفہ اور تصوف کا گہرا شعور ملتا ہے۔ ان کی متعدد نظمیں جو عام فہم موضوعات پر ہیں فلسفۂ حیات و ممات کی نمائندگی کرتی ہیں مثلاً فقیروں کی صدا، آدمی نامہ، کوڑی نامہ، عاشق نامہ، جوگی نامہ، موت، برسات کی بہاریں اور الٰہی نامہ وغیرہ نظمیں بہت اہم ہیں۔

جو شاہ کہاتے ہیں کوئی ان سے یہ پوچھو
دارا وسکندر وہ گئے آہ کدھر کو
مغرور نہ ہو شوکت و حشمت پہ وزیرو
اس دولت و اقبال پہ مت پھولو امیرو
نے ملک نہ دولت نہ سرانجام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

(الٰہی نامہ)

نظم 'بنجارہ نامہ' میں محاوروں کا انتخاب نہایت مدبرانہ، شعری تسلسل، اور روانی کے ساتھ ملتا ہے۔

کچھ کام نہ آوے گا تیرے یہ لعل و زمرد سیم وزر
جب پونجی باٹ میں بکھرے گی پھر آن بنے گی جاں اوپر
نوبت نقارے بان نشاں، دولت، حشمت فوجیں لشکر
کیا مسند تکیہ ملک و مکاں کیا چوکی کرسی تخت چھتر
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

(بنجارہ نامہ)

تنہا نہ اسے اپنے دل تنگ میں پہچان
ہر باغ میں ہر دست میں ہر سنگ میں پہچان
بیرنگ میں بارنگ میں نیرنگ میں پہچان
منزل میں مقامات میں فرسنگ میں پہچان
ہرآن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہراک رنگ میں پہچان

(عاشق نامہ)

''ہنس نامہ''، نظیر کی ایک ایسی معرکتہ الآرا نظم ہے جس میں ہندوستانی پرندوں مثلاً مینا، بگلا، کوئل، سارس، پپیہے، ہدہد، قمری، اور طاؤس وغیرہ کا ذکر بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ نظیر ایک خوبصورت پرندے کو علامت بنا کر بڑی سادگی سے زندگی کا فلسفہ اس طرح بیان کر جاتے ہیں۔

دنیا کی جوالفت ہے تو اس کی ہے یہ کچھ راہ
جب شکل یہ ہوے تو بھلا کیونکہ ہو نرباہ
ناچاری ہو جس جامیں تو واں کیجئے کیا چاہ
سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیر آہ
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

(ہنس نامہ)

نظم ''کلجگ'' میں زندگی کی سچائیوں اور تلخ حقیقتوں کا بیان اس طرح کیا ہے۔

کانٹا کسی کے مت لگا گر مثل گل پھولا ہے تو
وہ تیرے حق میں زہر ہے کس بات پہ پھولا ہے تو

کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

(کلجگ)

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

(مفلسی)

نظیر کا کلام ارباب تلاش کے لیے ایک سنجیدہ موضوع ہے ان کا مزاج قلندرانہ اور روح شاعرانہ ہے اوہ اپنے موضوعات میں عوام کے جذبات کی ترجمانی کو مقدم سمجھتے ہیں۔

نظیر کی شعری بصیرت دور اندیشی، دور بینی اور معلومات عامہ کے علاوہ حس مزاح، یعنی Sense of Humour اور جمالیاتی شعور جوان کے شاعرانہ فن کمال میں در آتی ہے اور حسن مطلق کو بے نقاب دیکھتی ہے۔

نظیر کی شعری کائنات کا کینوس نہایت وسیع اور موضوعات میں تنوع ہے۔ نظموں میں سادگی، مصوری، پاکیزگی، خوش طبعی، رندی، طنز وظرافت کی خیال آرائی، حقیقت پسندی، قلندرانہ حسرت ویاس اور جذبات کا ہجوم محسوس ہوتا ہے۔

نظیر نے سماج کے مختلف پہلوؤں کو مختلف انداز سے دیکھا اور پرکھا ہے ان کے کلام میں عالی ظرفی، پختہ خیالی، صلح کل، واعظانہ، قلندرانہ ناصحانہ، مصورانہ، اور فلسفیانہ تخیل، رنگینی، بے ساختہ لفظوں کی نشت و برخاست قوت خیال بحروں کا ترنم، عکاسی، آرٹ، قناعت دقیقہ رسی، اولیت و ابدیت، انسانی نفسیات کی مرقع کشی،

محاکات ، جمالیات، پیکر تراشی صناعانہ عظمت ، ایجاد و اختراع الفاظ کی درو بست ، جدت طرازی ،صنعتوں اور محاوروں کا برمحل استعمال ملتا ہے۔

نظیر کی اہم نظمیں مثلاً برسات کی بہاریں، فقیر کی صدا، کلجگ ، بانسری بنجارہ نامہ، دوالی، ہولی، جنم کنھیا، راکھی، ککڑی، بدیو جی کا میلہ اور کورا برتن کے علاوہ روحانی شخصیات پر نظمیں مثلاً معجزہ حضرت علی، حضرت سلیم چشتی اور نانک شاہ گرو قابل ذکر ہیں۔

نظیر کی نظموں کے عنوانات کے بارے میں بھی اختلاف ہے البتہ نظیر پر شہباز کا ایڈیشن قدرے معتبر ہے۔

آدمی نامہ نظیر کی مشہور نظم ہے۔لیکن در صنعت حق تعالیٰ کے عنوان سے'' آدمی نامہ کی طرز پر شیخ سعدی نے بھی ایک نظم لکھی تھی جو کریما میں شامل ہے سعدی کی فارسی نظم کے چند اشعار دیکھئے۔

یکے باجدار ویکے تاجدار
یکے سرفراز ویکے خاکسار
یکے بے نوا ویکے مالدار
یکے نامدار ویکے کامگار

آدمی نامہ منطقی نوعیت کی نظم ہے جہاں زندگی کا فکر و فلسفہ اور سچائیاں در آتی ہوئی نظر آتی ہیں۔نظیر کی نظر بڑی جامع اور بسیط ہے جس میں زندگی کے نشیب و فراز کو نہایت بامعنی اور پر مغز انداز میں پیش کیا ہے نظیر کے نزدیک ساری مخلوق میں انسان سب سے زیادہ معتبر، اور محترم اور اشرف المخلوقات ہے۔

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سوہے وہ بھی آدمی

نظیر کے یہاں لفظیات اور شعریات کا سیل رواں امڈتا ہوا محسوس ہوتا ہے ایک موضوع پر کئی کئی نظمیں موجود ہیں۔ موضوعاتی نظموں کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔

نظیر کو ہندو Myth پر ید طولیٰ حاصل تھی۔ جس کا اظہار ان کی مختلف نظموں اور اشعار میں موجود ہے۔

''بلدیو جی'' ان کی ایک شاہکار نظم ہے اس نظم میں میلے کا ہجوم کشمکش، چہل پہل کو نہایت انہماک اور دلچسپی کے ساتھ متصوفانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ نظم وحدت اور کثرت کا ایک حسین امتزاج ہے۔

ہے کہیں رام اور کہیں لکشمن
کہیں کچھ مچھ ہے اور کہیں راون
کیا مچی ہے بہار جے بلدیو
عیش کے کاروبار جے بلدیو
دھوم لیل و نہار جے بلدیو
ہر کہیں آشکار جے بلدیو
ہرزباں پر ہزار جے بلدیو
دمبدم یاد گار جے بلدیو
کہہ نظیر اب پکار جے بلدیو
سب کہو ایک بار جے بلدیو
رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلہ ہے

نظیر صوتی آہنگ سے پیکر کی تخلیق اور مترنم کیفیت سے صورت گری کرتے ہیں نظیر کی رمز شناس، بصیرت، فکر و نظر، رومانی کیفیات کی جلوہ ریزیاں انسانی فکر کو اپیل کرتی ہیں۔ ان کے یہاں مقامی رنگ کی سادہ اور سچی تصویریں زبان کی شرینی، لفظیات کی نزاکت اور شعری نغمگی محسوس کی جاسکتی ہے۔ نظیر کی بحریں پرکشش مترنم اور منفرد ہیں۔

''ہولی'' پر نظیر کی آٹھ نظمیں ہیں اردو کے کسی شاعر کے یہاں ہولی پر اتنی نظمیں موجود نہیں ہیں۔ پوری ہندی شاعری میں بھی ہولی پر نظیر سے بہتر اور اتنی معیاری نظمیں نہیں ملتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہیں اس تہوار سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ مذہبی عنصر کے علاوہ موسم کا تغیر و تبدل جو مترنم لفظوں کے انتخاب کے ذریعہ قاری تک پہنچتا ہے جسے پڑھتے وقت ایک روحانی فضا پیدا ہوجاتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو:

ہر آن خوشی سے آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں
رخسار گلالوں سے گلگوں کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ آگ اور رنگ جھمکتے ہیں کچھ مے کے جام چھلکتے ہیں
کچھ کودیں ہیں کچھ اچھلیں ہیں کچھ ہنستے میں کچھ بکتے ہیں
یہ طور یہ نقشہ عشرت کا ہر آن بنایا ہولی نے

مصرعوں میں نغمگی، تکرار اور قوت خیال ایک مخصوص قسم کی کیفیت صوتی آہنگ اور ذہنی سماں پیدا کردیتی ہے۔

ہولی پر ایک اور نظم جو مرئی پیکر کا شاہکار نمونہ پیش کرتی ہے۔

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

خم شیشے جام چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
منھ لال گلابی آنکھیں ہوں اور ہاتھوں میں پچکاری ہو
کپڑوں پر رنگ کے چھینٹوں سے خوش رنگ عجب گلکاری ہو
کچھ گھنگرو تال جھنکتے ہو تب دیکھ بہاریں ہولی کی
کپڑوں پر رنگ چھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
سینوں سے رنگ ڈھلکتے ہوتب دیکھ بہاریں ہولی کی
جب ایسے عیش لہکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

ہولی کے رنگوں میں محبوب کی خوبصورتی اور مقامی دشنام طرازی کا بیان نظیر کا فنی امتیاز ہے۔

نظیر کی شاعری ہر دور کے عوام کی آواز ہے لیکن اس آواز میں گہرا فلسفیانہ رنگ اور عارفانہ پیغام اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ جو سماجی مذہبی، تہذیبی، شخصی، ثقافتی، تاریخی، اور اصلاحی نوعیت کی جولانیوں سے لبریز نظر آتی ہے۔ عام فہم لفظوں میں فلسفیانہ لہجہ برقرار رکھنا شاعر کا فن کمال ہے۔

نظیر کا قلندرانہ کلام، فقیرانہ لہجہ اور درویشانہ رنگ ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتا ہے۔ ان کے یہاں شاہوں اور بادشاہوں کا رنگ نہیں ملتا بلکہ مفلسوں، قلندروں، گداؤں، مسکینوں، مجذوبوں اور صحرا نوردوں کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مثلاً نظیر کی نظم برسات کی بہاریں کے چند اشعار دیکھئے۔

کوئل کی کوک میں بھی تیرا ہی نام ہے گا
اور مور کی زٹل میں تیرا پیام ہے گا
یہ رنگ سو مزے کا جو صبح و شام ہے گا
یہ اور کا نہیں ہے ترا ہی کام ہے گا

کیا کیا مچی ہیں یاروں برسات کی بہاریں

نظیر کے کلام میں ہندوستانی عناصر کے حوالے سے فکر وفلسفہ اور حب الوطنی کا وہ جذبہ جو شاعری کے ذریعہ ہندوستان کی مٹی سے تعبیر ہے۔ اس نوع کی مثال صرف نظیر کے یہاں مل سکتی ہے نظم ''جنم کنھیا'' میں کنھیا جی کے متعدد صفاتی نام استعمال کیے ہیں۔ اس نظم کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو معاشرت وفلسفہ اور علم نجوم پر ان کی گہری نظر تھی۔

پھر آیا واں ایک وقت ایسا جو گرب میں آئے منموہن
گوپال، منوہر مرلی دھر، سیکشن، کشورن، کنول نین
گھنشام، مراری، بنواری، گردھاری سندر شیام برن
پربھوناتھ، بہاری کان للا، سکھ دائی جگ کے دکھ بھنجن
جب ساعت پرکھٹ ہونے کی واں آئی مکٹ دھرّ یا کی
اب آگے بات جنم کی ہے جے بولو کشن کنھیا کی

اگر اس نظم کو ہندی رسم خط میں تبدیل کر دیا جائے تو اردو نظم ہونے کا گمان تک نہیں ہوگا یہی نظیر کا فن کمال ہے۔

نظم ''بانسری'' موسیقی کی علامت ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی اقدار وعقائد کی بھی ترجمانی کرتی ہے۔ بانسری بجانا کشن کنھیا کا محبوب ترین شوق تھا۔ اگر چہ عام لوگوں کے لیے تفنن طبع اور مترنم لطافت کی علامت ہے۔ چند اشعار مثال کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔

موہن کی بانسری کے میں کیا کیا کہوں جتن
لے اس کی من کی موہنی دھن اس کی چت ہرن
اس بانسری کا آن کے جس جا ہوا بچن
کیا چل پون نظیر، پکھیرو کیا ہرن

سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

نظم 'نانک شاہ گرو' میں سکھوں کی مذہبی لفظیات اور پنجابی اصطلاحات کا استعمال ان کے مذہبی نقطہ نظر سے کیا گیا ہے۔

اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

نظیر کی شاعری ایک ایسا ہندوستانی پھولوں کا گلدستہ ہے جس میں مختلف مقامی رنگوں اور مختلف قسم کے پھولوں کی مہک محسوس کی جاسکتی ہے نظیر کی شاعری میں بازار کا تصور زیادہ مثبت نظر آتا ہے۔

نظم راکھی کے چند اشعار دیکھئے۔

چلی آتی ہے اب تو ہر کہیں بازار کی راکھی
سنہری، سبز ریشم، زرد اور گلنار کی راکھی
بنی ہے گوکہ نادر خوب ہر سردار کی راکھی
سلونوں میں عجب رنگین ہے دل دار کی راکھی

سلونوں کے تہوار کے موقع پر راکھی کی مذہبی اہمیت کو ہندوستانی معاشرت کے پس منظر میں رشتوں کی پائیداری کا تصور پیش کیا ہے۔

پانی کے سوندھے پن کو کورے برتن میں پینے کا جو لطف ہے۔ وہ بے شمار لوگوں کی پسند کا باعث ہے۔ نظیر نے نظم کورا برتن میں کورے برتن کے جس قدر نام ہو سکتے ہیں کم و بیش سبھی کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً افورہ، مٹکا، ٹھلیا، کوزہ جھجھر، صراحی وغیرہ کے ذکر ہی سے مطلب واضح ہو جاتا ہے۔

کورے برتن میں کیاری گلشن کی
جس سے کھلتی ہے ہر کلی تن کی

بوند پانی کی ان میں جب کھنکی
کیا وہ پیاری صدا ہے سن سن کی
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

(کورا برتن)

عجب بہار کا ہے دن بنادوالی کا
ہراک مکاں میں جلا پھر دیا دوالی
ہر اک طرف کو اجالا ہوا دوالی کا
سبھی کے دل میں سماں بھا گیا دوالی
کسی کے دل کو مزا خوش لگادوالی کا
عجب بہار کا ہے دن بنادوالی کا

(دوالی)

کیا پیاری پیاری میٹھی اور پتلی پتلیاں ہیں
گنے کی پوریاں ہیں ریشم کی تیلیاں ہیں
فرہاد کی نگاہیں شریں کی ہنسلیاں ہیں
مجنوں کی سرد آہیں لیلیٰ کی انگلیاں ہیں
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

(نظم ککڑی)

نظم 'آئینہ' جمالیات سے پر زندگی کے نشیب و فراز اور انسانی حسیات کی ترجمانی کرتی ہے۔

لے آئینے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ
صورت میں اپنی قدرت پر ور دگار د یکھ
خال سیاہ اور خط مشک بار دیکھ
زلف دراز وطرۂ عنبر نثار دیکھ
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

(نظم آئینہ)

نظیر نے ایک ہلکی سی اور سادہ نظم 'سمدھن' کے عنوان سے کہی تھی اس نظم میں سمدھن سے متعلق جزئیات کا انتخاب نہایت فن کارانہ انداز میں کیا ہے۔

کمر نازک، مٹکتی چال، آنکھیں شوخ، تن گورا
نظر چنچل، ادا چیل، یہ ہے پہچان سمدھن کی
سنہری تاش کا لہنگا روپہلی گوٹ کی انگیا
چمکتا حسن جوبن کا، چمکتی آن سمدھن کی
ملائی ساشکم، سینہ 'مصفا' خوشنما ساقیں
صفا زانو کا آئینہ ملائم ران سمدھن کی

صوری اور معنوی ہم آہنگی سے کلام میں لطف پیدا ہوجاتا ہے۔ مثلاً روٹی کے موضوع پر عالمی شاعری میں تلاش کرنے پر اس نوع کی نظم نہیں ملتی۔

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو
میلے کی سیر خواہش باغ و چمن نہ ہو
بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو
سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

ناقدین ادب نے نظیر کے بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا ہے۔ شیفتہ نے گلشنِ بے خار میں شاعر سوتی کہا ہے، مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ نظیر کو شاعر سوتی کہہ کر برطرف نہیں کیا جا سکتا وہ اردو کا پہلا اور غالباً آخری عوامی شاعر ہے زبان و بیان کے لحاظ سے یہ سب نظیر کی عوامی شاعر ہونے کے طفیل ہے۔ نظیر کی شاعری میں خود نظیر کی شخصیت موجود ہے۔ کیونکہ نظیر اپنے عہد کی معاشرت کا سچا مصور ہے۔ وہ مارکسی تصوراتِ معیشت کی ہوا لگے بغیر روٹیوں، چپاتیوں اور مفلسی کو اپنا موضوع سخن بناتا ہے اور اس شان سے کہتا ہے کہ:

اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

نظیر بڑا سیکولر مزاج، دلچسپ، انوکھا اور منفرد شاعر ہے۔ لیکن عظیم شاعر نہیں ہے۔ مسعود حسین خاں کے اس نظریے سے قدرے اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ نظیر اپنی طرز کا عظیم شاعر ضرور تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

نظیر نے اپنی ہر نظم میں خود کو نہ صرف عوام کے ساتھ وابستہ کرنے کی سعی کی بلکہ ان کے جذبات کی بدرجہ اتم ترجمانی بھی کی۔

نظیر کو فارسی زبان و ادب سے گہرا شغف تھا۔ نظیر نے اپنا ایک فارسی دیوان مرتب کیا تھا۔ جو دستیاب نہیں ہے البتہ ان کے اردو کلیات میں چند فارسی غزلیں، چار منظوم خطوط، چھبیس رباعیات اور دو واسوخت شامل ہیں۔

نظیر اکبرآبادی نے اردو نثر میں اپنی کوئی یادگار نہیں چھوڑی البتہ نظیر کے شاگرد سید قطب الدین باطن نے گلستان بے خزاں میں نظیر کی نو نثری کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے نام صرف سات کے گنوائے ہیں۔ عبدالغفور ان نو تخلیقات میں سے صرف پانچ کو لکھ سکے ہیں (بحوالہ عبدالغفور زندگانی بے نظیر)

نظیر نے تقریباً اٹھانوے برس کی عمر پائی بے فکری اور بے نیازی ان کی طبیعت کا خاصا تھا بیک وقت آٹھ زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ نظیر نے نواب واجد علی

شاہ کے بلاوے کو انکار کر دیا انہیں اپنے معاشرے سے بے پناہ محبت تھی۔ گارسیں دتاسی نے لکھا ہے کہ نظیر نے اردو کلام کی دو جلدیں ورثے میں چھوڑی ہیں پہلا دیوان جو دیو ناگری رسم الخط میں ہے ۱۸۲۰ء میں شائع ہوا۔ بعد ازاں ۱۸۵۰ء ان کا پہلا اردو دیوان شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ عبدالحئ کی گلِ رعنا اور عبدالسلام ندوی کی شعر الہند میں نظیر کا ذکر نہیں ملتا۔

نظیر کو اپنے عہد کا روایت شکن شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ نظیر نے سب سے زیادہ لفظوں کا استعمال کیا اور دو لاکھ سے زیادہ اشعار کہے۔ وہ ادنیٰ طبقے کا شاعر ہے اس کے کلام میں زندگی کے ممکنہ رنگ نظر آتے ہیں۔

ادب کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی نیز اردو میں تراکیب اصطلاحات وضع کرنے کی روایت بھی نظیر نے قائم کی۔

نظیر ہندوستانی رنگ کا حقیقت شناس شاعر ہے اس کی شعری کائنات اور فکری جہات کی نمائندگی اس شعر سے ہوتی ہے۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
گفتگو پر مجھے عوام سے ہے

☆☆☆

ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیاں اور اداروں میں اردو فاصلاتی نظامِ تعلیم

ہندوستان میں فاصلاتی نظام تعلیم کا آغاز ملک گیر سطح پر 1985ء میں اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے قیام سے ہوا۔ جب کہ ریاستی سطح پر اردو تعلیم کا آغاز بی آر امیڈکر اوپن یونیورسٹی، حیدرآباد کا رہین منت ہے، جو 1982ء میں عمل میں آیا۔

اردو میں فاصلاتی اور مراسلاتی دو طرح کے نظام تعلیم رائج ہیں۔ بعض اداروں میں براہ راست طلباء کے لیے امتحان دینے کا بھی انتظام ہے لیکن یہ طریقہ کار فاصلاتی نظام تعلیم کے زمرے میں نہیں آتا۔ زیر نظر مضمون میں ہم نے صرف انہیں اداروں کو شامل کیا ہے جن میں باضابطہ فاصلاتی نظام کا شعبہ قائم ہے۔

اردو زبان وادب کی تدریس کے علاوہ کئی یونیورسٹیوں میں اردو ایک میڈیم کے طور پر بھی استعمال میں ہے، یعنی ان درسگاہوں میں طلباء کو یہ سہولت حاصل ہے کہ بی اے کے تمام مضامین میں اردو میں پڑھیں اور امتحان بھی اردو میں دیں۔

ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، حیدرآباد

اس یونیورسٹی میں گریجویشن کی سطح پر بی اے، بی ایس سی، بی کام میں اردو میڈیم کے ذریعہ امتحان میں شریک ہونے کی اجازت ہے۔ علاوہ ازیں بی اے کی سطح پر اردو ایک جدید ہندوستانی زبان کی حیثیت سے شامل کی گئی ہے۔ نصاب درج ذیل ہے:

بی اے (سال اول) دو کتابیں۔

(۱) بنیادی کورس.....حصہ اول

(۲) بنیادی کورس.....حصہ دوم

بنیادی کورس حصہ اول، چھ یونٹ پر مشتمل ہے:

یونٹ ۱- اردو کی بولیاں اور معیاری اردو

یونٹ ۲- افعال کا استعمال، تذکیہ و تانیث

یونٹ ۳- اردو الفاظ کی اصل، سنسکرت، عربی، فارسی سے رشتے، املا وغیرہ

یونٹ ۴- اوقاف، استدلال کی ترتیب، علامتیں۔

یونٹ ۵- ترجمہ اصول اور طریقۂ کار، جملوں کی ساخت، ترتیب، متبادل صورتیں

یونٹ ۶- مضمون نگاری، روداد نگاری، کاروباری خطوط۔

بنیادی کورس حصہ دوم دو یونٹ پر مشتمل ہے:

یونٹ ۷- تخلیقی ادب کے انتخاب (غزلیں)

☆ شعری تراکیب

☆ غزلیں (کلاسیکی) میر تقی میرؔ، مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

☆ غزلیں (جدید) الطاف حسین حالیؔ، حسرت موہانی، فانیؔ، بدایونی، فراقؔ گورکھپوری، ناصر کاظمی وغیرہ۔

☆ خوشامد //نظیر اکبر آبادی

☆ فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں //محمد اقبال

☆ روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے //محمد اقبال

☆ سرمایہ داری //اسرار الحق مجازؔ

☆ اجنتا //سکندر علی وجد

اردو کی نثری اصناف

مختصر افسانے:

☆ قاتل کی ماں منشی پریم چند

☆ ضرب، تقسیم شوکت تھانوی

☆ جامن کا پیڑ کرشن چندر

مضامین:

☆ محمد قلی قطب شاہ محی الدین قادری زور

☆ علامہ اقبال ممتاز حسین

☆ ہم لندن سے لوٹے ابن انشاء

یونٹ ۸- تہذیبی مضامین، تہذیبی پس منظر:

☆ واجد علی شاہ اور مٹیا برج عبدالحلیم شرر

☆ اردو کی کہانی سید احتشام حسین

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، دہلی

اس یونیورسٹی میں فاصلاتی تعلیم کے تحت اردو میں ڈپلوما، گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن میں سے چند کورسز شروع ہو چکے ہیں۔

کرناٹک اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی:

بی اے میں داخلے کے خواہش مند طلبا انگریزی، ہندی، کنڑ، ملیالم، تامل، تلگو، سنسکرت اور اردو میں سے کوئی دو مضامین منتخب کر سکتے ہیں۔

یو۔ پی راج کشن ٹنڈن اوپن یونیورسٹی، الہ آباد:

اس کے اسٹڈی سینٹر یوپی کے مختلف شہروں، مثلاً الہٰ آباد، پرتاب گڑھ، غازی پور، اعظم گڑھ، گورکھپور، کشی نگر، فیض آباد، لکھنؤ، گونڈہ، بہرائچ، کانپور، لکھیم پور، کھیری، اوبرا، مرزا پور، علی گڑھ، بلند شہر، مراد آباد، سری نگر، دہرا دون بستی، بنارس، جونپور، مظفر نگر، بجنور، کانپور، بلیا، باندہ، سہارنپور، ہلدوانی، جھانسی، بریلی، نینی تال اور غازی آباد وغیرہ میں کام کر رہے ہیں۔

گریجویشن (آرٹس) میں اردو اختیاری مضمون کے طور پر شامل ہے۔

پرچے:

۱- اردو نظم (اول)

۲- اردو نثر (اول)

۳- اردو غزل

۴- اردو نظم (دوم)

۵- اردو نثر (ڈرامہ اور ناول)

۶- اردو ادب کی تاریخ اور تنقید

۷- اردو قواعد اور مضمون نگاری

۸- اردو ادب کا عمومی جائزہ

(نوٹ: اس یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب سے متعلق ایک ڈپلومہ کورس بھی موجود ہے۔)

دہلی یونیورسٹی میں مراسلاتی کورس

جدید ہندوستانی زبان کے طور پر یہاں اردو میں گریجویشن کی سہولت موجود ہے۔

نصاب

paper-۱

☆ خیابانِ ادب (حصہ غزل و نظم)

غزلیات:

☆ حسرتؔ موہانی

☆ الطاف حسین حالیؔ

☆ علی سکندر جگرؔ مرادآبادی

☆ اخترؔ شیرانی

☆ شادؔ عارفی

☆ رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری

نظمیں:

☆ چکبستؔ لکھنوی
☆ جوشؔ ملیح آبادی
☆ فیض احمد فیضؔ
☆ اختر شیرانی
☆ خیابانِ ادب (حصہ نثر)
☆ میر امنؔ دہلوی
☆ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ
☆ سرسید احمد خاں
☆ مرزا فرحت اللہ بیگ
☆ منشی پریم چند
☆ رشید احمد صدیقی

نصاب

paper-II

☆ خیانِ ادب (حصہ نثر)

اسباق:

☆ محمد حسین آزاد
☆ نذیر احمد
☆ الطاف حسین حالیؔ
☆ شبلی نعمانی
☆ رتن ناتھ سرشارؔ

☆ امتیاز علی تاجؔ
☆ راشد الخیری
☆ عبدالحلیم شررؔ
☆ اردو کے تیرہ افسانے// اطہر پرویز

کہانیاں:

☆ کفن //منشی پریم چند
☆ مہالکشمی کا پل //کرشن چندر
☆ آنندی //غلام عباس
☆ اپنے دکھ مجھے دے دو //راجندر سنگھ بیدی
☆ چوتھی کا جوڑا //عصمت چغتائی

paper-III

ڈرامہ:

☆ نئے ڈرامے محمد حسن

غزلیں:

☆ میر تقی میرؔ
☆ خواجہ میر دردؔ
☆ حیدر علی آتشؔ
☆ مرزا اسد اللہ خاں غالب
☆ مومن خاں مومنؔ
داغؔ دہلوی

مثنوی:

☆ میر حسن

☆ دیا شنکر نسیم

مراثی:

☆ میر انیسؔ

☆ مرزا دبیر

منظومات:

☆ نظیر اکبر آبادی

☆ الطاف حسین حالی

☆ اکبر الٰہ بادی

☆ محمد اقبالؔ

Urdu Elective

2 + کیے ہوئے یا X,IX میں اردو کے ساتھ 45% نمبر حاصل کرنے والے یا جامعہ اردو، علی گڑھ سے مساوی امتحان پاس کیے ہوئے امیدوار ذیل کے 3 پرچوں میں امتحان دے سکتے ہیں:

نصاب

☆ شعور ادب مکتبہ جامعہ

منظومات:

☆ نشاطِ امید	الطاف حسین حالیؔ
☆ برق کلیساں	اکبر الٰہ آبادی
☆ گوپال کرشن گوکھلے	چکبستؔ لکھنوی
☆ ساقی نامہ	محمد اقبالؔ
☆ بدلی کا چاند	جوشؔ ملیح آبادی
☆ کتے	فیض احمد فیضؔ

☆رات اور ریل اسرار الحق مجاز
☆میرے عہد کے حسینو ساحر لدھیانوی

غزلیات:
☆شاد عظیم آبادی
☆حسرت موہانی
☆فانی بدایونی
☆فراق گورکھپوری
☆مجروح سلطان پوری
☆اردو کے تیرہ افسانے اطہر پرویز

کہانیاں:
☆مہالکشمی کا پل
☆آنندی
☆اپنے دکھ مجھے دے دو
☆چوتھی کا جوڑا
☆آخری کوشش
☆نظارہ درمیاں ہے

نصاب

paper-II

شعور ادب (حصہ نظم وغزل)
غزلیں:
☆میر تقی میر
☆مرزا سودا

☆خواجہ میر درد
☆داغ دہلوی

نظمیں:

☆نظیر اکبر آبادی
☆میر حسن
☆میر حسن
☆میر انیس
☆ذوق دہلوی
☆شعور ادب (حصہ نثر)

مضامین:

☆رجب علی بیگ سرور
☆مرزا غالب
☆سر سید احمد
☆محمد حسین آزاد
☆الطاف حسین حالی
☆شبلی نعمانی
☆نذیر احمد
☆رتن ناتھ سرشار

نصاب

paper-III

حصہ اول: ادبی تحریکات و انقلابات

حصہ دوم: مضامین اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ

ادبی تحریکات:

☆فورٹ ولیم کالج
☆دلّی کالج
☆سرسید تحریک
☆ترقی پسند تحریک
☆دہلی اور لکھنؤ کا دبستان شاعری
☆مرثیہ، مثنوی، ناول اور افسانے کا ارتقاء

حصہ اوّل کے لیے مجوزہ کتب:

☆اردو ادب کی ایک صدی // ڈاکر سید عبداللہ
☆اصناف ادب اردو // قمر رئیس و خلیق انجم
☆نئے ادبی رجحانات // سید اعجاز حسین
☆مختصر ترین تاریخ ادب اردو // سلیم اختر
☆ترجمے کا فن اور روایت // ڈاکٹر قمر رئیس
☆مختصر تاریخ ادب اردو // سید اعجاز حسین
☆ادب کسے کہتے // اطہر پرویز

بنگلور یونیورسٹی، بنگلور:

ایم اے (اردو) بذریعہ فاصلاتی نظام

نصاب

paper-I

نثری مضامین:

☆سب رس
☆کلمۃ الحقائق

☆نوطرزِ مرصع
☆افادات سلیم

paper-II

منظومات:

☆انتخاب کلام میرؔ
☆مراثیٔ انیسؔ
☆غزلیاتِ غالبؔ
☆شعلۂ طور.....جگر مرادآبادی
☆بالِ جبریل.....محمد اقبالؔ

paper-III

☆اردو زبان وادب کی تاریخ

paper-IV

☆ گلستانِ سعدیؔ
☆مثنوی مولانا روم
☆غزلیات حافظؔ
☆رباعیات عمر خیام
☆شعرالعجم .....محمد اقبال

paper-V

ادبی تنقید، علم العروض و بلاغت

paper-VI

☆اردو فکشن

مطالعات

☆توبۃ النصوح
☆فردوس بریں
☆میدانِ عمل
☆زندگی کے موڑ پر
☆انارکلی
☆خانہ جنگی

paper- VII

☆مثنوی، تنقید، غزل، ڈرامہ

paper- VIII

☆ولی
☆سرسید احمد خاں
☆مولوی عبدالحق
☆شبلی نعمانی
☆فیض احمد فیض

☆☆☆

فیضؔ کے خطوط ۔ اجمالی جائزہ

فیض احمد فیضؔ ایک غیر معمولی تخلیق کار اور دانشور تھے ۔ ان کے تخلیقی سرچشمے شاعری کی شکل میں ہوں یا نثر پارے اُردو زبان وادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ فیضؔ کو اپنے تخلیقی سفر میں جتنی دلچسپی شاعری سے رہی اتنا ہی شغف انہیں نثر سے بھی رہا شاید یہی وجہ ہے کہ فیض کے نثری اور شعری مجموعوں کی تعداد کم وبیش برابر ہے۔ اس بات کا اعتراف فیض نے اپنے آخری انٹرویو میں بی بی سی لندن کے نمائندے کرشن گولڈ کو دیتے ہوئے کیا تھا کہ جو کام ہمیں کرنا چاہیئے تھا وہ ہم اس لیے نہیں کر پائے کہ ہمیں وہ کام کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی مثلاً ہم یہ چاہتے تھے کہ شاعری کو چھوڑ کر ادب کے بارے میں جم کر بیٹھ کر کچھ لکھیں مثلاً ناول نے کیسے اور کیوں جنم لیا۔ ہمارے ہاں ادبی تاریخ تو کافی لکھی گئی ہے لیکن وہ سب سطحی ہے ۔ اس میں ادبی معاملات پر غور کیا گیا ہے لیکن ادب کے جو معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی رشتے ہیں ان پر زیادہ غور نہیں کیا گیا ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ یکسوئی کے ساتھ بیٹھ کر اس خلا کو پُر کر لیا جائے یہ کافی لمبا اور محنت طلب کام ہے جو ہم ابھی تک نہیں کر سکے۔

فیضؔ کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اُردو ادب کی تاریخ لکھنے میں بھی دلچسپی رکھتے تھے، لیکن وقت نے انہیں مہلت ہی نہیں دی۔ اُردو، فارسی اور عربی زبانوں کے علاوہ انہیں انگریزی زبان پر بھی ید طولیٰ حاصل تھی۔ اگر چہ ان کی تربیت دینی ماحول میں ہوئی تھی اور حفظ قرآن سے انہوں نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا تھا لیکن ادب کے علاوہ ان کا مطالعہ سائنس، فلسفہ، نفسیات، سیاسیات، تاریخ، تصوف اور مذہب پر بھی بہت وسیع تھا۔ مغربی اور مشرقی مفکرین نقاد اور دانشور جو ان کے زیر مطالعہ رہے یا پھر وہ ان سے متاثر

رہے ان میں سرسید، حالی، اقبال، گوئٹے، ملٹن، دانتے، سقراط، ٹالسٹائے، برنارڈ شاہ، ارسطو، ہیگل، مارکس اور نطشے وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ان مفکرین اور دانشوروں کا ذکر ان کی تحریروں اور خصوصاً خطوط میں کسی نہ کسی حوالے سے ضرور مل جاتا ہے۔

خطوط لکھنے کی تحریک انہیں اپنے والد سے بچپن میں ملی تھی۔

فیض کے والد سلطان بخش جو بعد میں سلطان محمود خاں کہلائے۔ ان کا تعلق پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں 'کالا قادر' کے سب سے مفلس اور نادار گھرانے سے تھا۔

فیضؔ نے لکھا ہے کہ :

''جب ابّا پانچ برس کے ہوئے تو غرباء کی روایت کے مطابق انہیں پڑھنے کے بجائے روٹی کمانے کا فن سکھایا گیا۔ دیہات والوں نے ہمارے ابّا کو مویشی چرانے پر لگا دیا اور اس خدمت کے معاوضہ میں ان کی روٹی کا خرچ برداشت کرلیا۔ اب ابّا صبح سویرے ریوڑ لے کر دیہات سے باہر چلے جاتے۔ گلہ بانی کرتے، مویشی گھاس چرتے اور یہ کسی درخت کے سایے میں بیٹھے دور اسکول اور اس میں طلبہ کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے۔''

فیضؔ یہ بات کبھی فراموش نہیں کر سکے کہ ان کے والد گاؤں کے ایک چرواہے تھے کچھ عرصہ انہوں نے قلی کے طور پر بھی کام کیا بعد ازاں وہ اپنی محنت شاقہ اور جدوجہد سے سیالکوٹ کے مشہور بیرسٹر ہوئے اور انگلستان میں افغانستان کے سفیر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں ان کی مشہور تصانیف میں ''افغانستان کے دستوری قوانین'' اور ''امیر عبدالرحمٰن کی سوانح عمری'' شامل ہیں۔ یہ دونوں کتابیں انگریزی زبان میں ہیں۔

فیضؔ کی ذہنی تربیت میں ان کے والد کا بہت اہم حصّہ رہا۔ ''فیضؔ کی کہانی فیض کی زبانی'' میں انہوں نے اس کا اعتراف اس طرح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''رات کوابّا ہمیں بلالیا کرتے تھے۔ خط لکھنے کے لیے اس زمانے میں انہیں خط لکھنے میں کچھ دقّت ہوتی تھی ہم ان کے سکریٹری کا کام انجام دیتے تھے انہیں اخبار بھی پڑھ کر سناتے تھے۔ان مصروفیات کی وجہ سے ہمیں بچپن میں بہت فائدہ ہوا۔ اُردواور انگریزی کے اخبارات پڑھنے اور خطوط لکھنے کی وجہ سے ہماری استعداد میں کافی اضافہ ہوا۔''

طلسم ہوش ربا، فسانۂ آزاداور عبدالحلیم شرؔر کے ناول دکان سے کرائے پر لاکر پڑھتے تھے۔ڈکسن اور ہارڈی کے ناول بھی فیضؔ نے بچپن ہی میں پڑھ ڈالے تھے۔

فیض نے اپنی ملازمت کا آغاز امرتسر کے ایم۔اے۔او کالج سے بحیثیت انگریزی لکچرر کیا تھااوراخباروں میں ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔

قیام پاکستان کے تقریباً تین سال بعد ہی 1951 میں لیاقت علی خاں کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی سازش میں فیض اور سجاد ظہیر گرفتار کر لیے گئے۔ یہ کیس ''راولپنڈی سازش'' مقدمے کے نام سے مشہور ہے۔فیض نے چار سال تین ماہ اور گیارہ دن قید کی صعوبتیں اُٹھائیں۔تقریباً تین ماہ انہیں قید تنہائی کی بھی سزا ملی۔ یہ عرصہ انہیں سرگودھااور لائل پور کی جیلوں میں گذارنا پڑا۔ جہاں فیض کو اپنے دوست احباب، اہلِ خانہ اور بیوی بچوں سے ملنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ ستم ظریفی یہ کہ یہاں وہ اپنا قلم بھی استعمال نہیں کر سکتے تھے۔

بہرحال فیض کی بیشتر شعری تخلیقات اور خطوط ان کے ایّام اسیری کی یادگار ہیں۔ متعدد خطوط حیدرآباد جیل، منٹگمری، ساہیوال جیل اور لاہور سینٹرل جیل ہی میں لکھے گئے۔

فیض کے خطوط کا صرف ایک مجموعہ ''صلیبیں میرے دریچے میں'' 1972 میں شائع ہوکر منظر عام پر آیا تھا۔ یہ خطوط انہوں نے اپنی بیگم ایلس 'ALYS' کے نام انگریزی میں تحریر کیے تھے جو مختلف اوقات میں مختلف جیلوں سے لکھے گئے تھے۔ ان خطوط کا اُردو ترجمہ فیض نے منہ زبانی مرزا ظفر الحسن کو کرایا تھا ''صلیبیں مرے دریچے میں'' فیض

کے ایّام اسیری کے 135 خطوط شامل ہیں اس کتاب کو مرزا ظفر الحسن نے مرتب کیا تھا۔ ہندوستان میں یہ کتاب جنوری 1974 میں پہلی بار اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کی تھی۔ اس کتاب کا انتساب فیض کی اپنی بیٹیو چھیمی اور میزو کے نام کیا ہے۔

خطوط کی تفصیل بہ لحاظ ماہ وسال اس طرح ہے:

حیدرآباد جیل سے لکھے گئے خطوط کی تعداد 92 ہے۔

(7/جون 1951 تا 19/جون 1953)

کراچی جیل اور جناح ہسپتال کراچی سے لکھے گئے خطوط کی تعداد 8 ہے۔

(جون 1953 تا گست 1954)

منٹگمری ساہیوال جیل سے لکھے گئے خطوط کی تعداد 35 ہے۔

(اکتوبر 1954 تا اپریل 1955)

اس طرح 1951 سے لے کر 1955 تک یعنی تین سال گیارہ ماہ کے عرصہ میں فیض نے 135 خطوط تحریر کیے۔ یہ وہ خطوط ہیں جن کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا گیا۔ انگریزی خطوط کی تعداد ان سے زیادہ ہے۔ ان خطوط کے بارے میں فیض نے ''گذارشِ احوال واقعی'' میں لکھا ہے :

''ظاہر ہے یہ کوئی ادبی تصنیف نہیں ہے نجی خطوط میں جو قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں کسی مربوط اور سنجیدہ بحث کی تلاش بے کار ہے۔''

خطوط کے اردو ترجمے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جیسے قلم برداشتہ یہ خطوط لکھے گئے تھے ویسے ہی منھ زبانی ان کا ترجمہ کیا گیا ہے اور زبان و بیان کی ان کوتاہیوں کی ذمہ داری بھی مرزا صاحب ہی کے سر پر ہے۔''

بیگم فیض ایک سادہ مزاج، خلیق اور محبت کرنے والی خاتون تھیں ان کی خواہش تھی کہ فیض کے خطوط چھپیں اور اُردو ہی میں چھپیں تا کہ حق دار کو حق مل جائے یعنی شعری

تخلیقات کی طرح نثری تخلیقات بھی ادب کے قبضے میں آ جائیں۔

فیض اپنے خطوط پر اکثر دن ہی لکھا کرتے تھے اور کبھی کبھار تاریخ درج کی بھی تو مہینہ ندارد۔ ایلس نے لکھا ہے کہ ''قسم لے لیجئے کہ کبھی سال درج کیا ہو'' بعض خطوط پر تو نہ دن لکھا ہے نہ تاریخ اور نہ سال، خط وصول ہوتے ہی ایلس پابندی کے ساتھ تاریخ اور سال وغیرہ درج کر دیا کرتی تھیں ایلس نے اپنی جان سے زیادہ عزیز اور قیمتی سمجھ کر ان خطوط کو بیس سال تک حفاظت کے ساتھ رکھا اور ان کی اشاعت کی اجازت دینا احسان ہے۔'' ان تاثرات کا اظہار مرزا ظفرالحسن نے کتاب کے دیباچہ میں کیا ہے۔

خطوط کے ترجمے کے سلسلے میں طریقۂ کار یہ رہا کہ فیض پہلے تو پورا خط پڑھ لیتے، اس کے بعد اس کا ترجمہ مجھے لکھواتے، میں اسی رات بیٹھ کر وہ ترجمہ صاف خط میں لکھ دیتا، دوسرے دن فیض اس پر نظر ثانی کرتے، نظر ثانی کے بعد وہ ترجمہ ٹائپسٹ کو دے دیا جاتا، کتابت شدہ خطوط آ جاتے تو سحر انصاری پروف کی تصحیح کرتے۔ اس طرح ترجمے، نقل نویسی، ٹائپ، کتابت اور پروف ریڈنگ کے پانچ محاذوں پر پابندی اور تیزی کے ساتھ کام ہوتا رہا۔

فیض نے ابتدا میں سو خطوط چھاپنے کا ارادہ کیا لیکن مرزا ظفرالحسن اس بات پر راضی نہیں ہوئے اور بعد میں خطوط کے غیر ضروری حصوں کو حذف کر دیا گیا۔

فیض کے محققین، نقاد اور عام قارئین بھی یہ ضرور جاننا چاہیں گے کہ کس قسم کے حصوں کو حذف کیا گیا اس لیے یہ سب تفصیل بتا دینا ضروری ہے۔

حذف شدہ حصّے اس طرح ہیں۔

اصل خطوط انگریزی میں ہیں اس لیے ایلس کو ڈارلنگ، سویٹ ہارٹ، ڈیرسٹ، ڈیروائف، بی لوئڈ اور ڈیرلو سے مخاطب کیا ہے۔ اپنی بچیوں چھیمی اور میزو کو FUNNY FACES اور 'MY PIGEON' لکھا ہے۔ بعض معذرت والے جملے، ان لوگوں کے تذکرے جن کے نام خطوط میں موجود ہیں۔ مگر واقعات کی تفصیل فیض کو یاد نہیں رہی،

مقدمے کی دفتری نوعیت کی باتیں، روزمرہ کی ضروریات کے لئے فرمائشیں، حساب کتاب اور بہت سے غیر اہم گھریلو معاملات، ان کے علاوہ کچھ اور باتیں جیسے ایلس کی سال گرہ بھول گئے اپنی شادی کی سال گرہ یاد نہ رہی وغیرہ حذف کر دی گئی ہیں۔

''کتاب اور صاحب کتاب کی کہانی'' کے عنوان سے مرزا ظفر الحسن نے خطوط کے مجموعے پر دیباچہ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا ظفر الحسن زیادہ پڑھے لکھے انسان نہیں تھے۔ خطوط کا ترجمہ لکھتے وقت انہوں نے بہت سی چیزیں ادھوری بھی چھوڑی ہیں۔ بہرحال مرزا ظفر الحسن فیض کے قریب ترین دوستوں میں سے تھے اُردو میں فیض کے مکتوبات کا یہ سرمایہ جو کتابی شکل میں شائع ہو کر منظر عام پر آ سکا۔ ایلس فیض کی تحریک اور دلچسپی اور مرزا ظفر الحسن کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

اختصار کے ساتھ ہی سہی مگر ان کے خطوط میں موضوعات کا بے انتہا تنوع موجود ہے۔ مثلاً محبت، پیار، حسن، زندگی، مطالعہ، شاعری، باغبانی، وقت، حرص، خود پسندی، خود فراموشی، خود بینی، شکایتیں، حکایتیں، کاہلی، کاروبار، ادیبوں اور ادب پاروں پر فیض کا تبصرہ وغیرہ۔

فیض کے خطوط کے چیدہ چیدہ اقتباسات ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں:

> ''منٹو کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا سب کمزوریوں کے باوجود مجھے نہایت عزیز تھے اور اس بات پر مجھے فخر بھی ہے کہ وہ امرتسر میں میرے شاگرد تھے اگرچہ یہ شاگردی برائے نام ہی تھی اس لیے کہ وہ کلاس میں تو شاید ہی کبھی آتے ہوں۔ البتہ میرے گھر پر اکثر صحبت رہتی تھی اور چیخوف، فرائڈ اور موپساں اور نہ جانے کس کس موضوع پر گرم مباحثے ہوتے تھے۔ بیس برس گذر چکے لیکن یوں لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ ہمارے شرفاء جنہیں دورِ حاضر کے فنکاروں کی شکستِ دل کا نہ احساس ہے نہ اس سے کوئی ہمدردی۔ غالباً

یہی کہیں گے کہ منٹو مر گیا تو اس کا اپنا قصور ہے بہت پیتا تھا بہت بے
قاعدہ زندگی بسر کرتا تھا۔ صحت کا ستیاناس کر لیا تھا وغیرہ وغیرہ۔''

مجموعے کے پہلے خط کا ایک مختصر اقتباس دیکھیئے :

''تین چار دن جو لاہور میں گذرے ایّام اسیری کے سب سے اذیت ناک دن تھے۔ جب مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اپنے چاہنے والوں کو کسی ایسی چیز کی خاطر دکھ اور اذیب پہنچانا، جو خود کو بہت عزیز ہو، لیکن ان کے لیے کچھ معنی نہ رکھتی ہوں، غلط اور ناجائز بات ہے۔ اس نظر سے دیکھو تو آئیڈیل ازم یا اصول پرستی بھی خودغرضی کی ایک صورت بن جاتی ہے۔ اس لیے کہ اپنے کسی اُصول کی دُھن میں آپ یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ دوسروں کو کیا چیز عزیز ہے اور اس طرح اپنی خوشنودی کی خاطر دوسروں کا دِل دُکھاتے ہیں۔''

فیض کے خطوط بڑے دلچسپ اور فکر انگیز ہیں۔ فطرت انسانی کی باریکیوں کو بڑے سہل اور عالمانہ انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں :

''ایک خاص عمر کے بعد انسان بنیادی طور سے اپنے آپ کو بدل نہیں سکتا اور اپنی اصلاح کے بارے میں زیادہ خوش فہمی فضول ہے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ جب تک چند کڑی آزمائشوں سے گزرنا نہ پڑے اپنی ذات کے جھوٹ سچ کا پتہ ہی نہیں چلتا نہ اپنی اصل شخصیت اور اس شخصیت کے درمیان فرق واضح ہوتا ہے، جو دکھاوے کے لیے آدمی دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔''

فیض کی زندگی کے ذاتی تجربات، ایزانصیباں، تلخ حقائق اور دیگر کیفیات کا عکس فیض کے خطوط میں اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ شخصیت کے بارے میں نہایت ہی سہل انداز میں اس طرح تجزیہ کرتے ہیں :

''میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ انسانی رنج اور ناخوشی کی بنیاد دراصل یہی خود پسندی ہے۔ یعنی اپنی ذات سے بہت زیادہ اہمیت وابستہ کرنا، افسردگی، بددلی اور خودترحمی کے احساسات کی تہہ میں بھی یہی گِلہ کار فرما رہتا ہے کہ ساری کائنات ہماری ذاتی تمنّاؤں کے مطابق کیوں تشکیل نہیں دی گئی۔''

''زندگی کی جدوجہد میں صرف جدوجہد ہی کافی نہیں یہ بھی ضروری ہے کہ انسان یہ لڑائی بشاشت اور خوش طبعی سے لڑنے اور اپنے پر دردمندی اور ترحم کے جذبات طاری نہ ہونے دے ورنہ غنیم کا پلّہ اور بھی گراں بن جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایک حد تک یہ اپنے اپنے مزاج کی بات ہے اور آدمی بالارادہ وہ سب کچھ نہیں کرسکتا جو اسے کرنا چاہیئے۔ لیکن مشکلات کیسی بھی ہوں اپنی طرح کی کوشش تو لازم اور واجب ہے۔''

''اپنی صلاحیت اور ہنر تو بہت محدود ہے اور بہت سے لوگ مجھ سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ بات صرف محنت اور عرق ریزی کی ہے۔ خاص طور سے بیانیہ تحریر میں اس نوع کی تحریریں سہل انگاری کی وجہ سے میلان پر ہوتا ہے کہ جو بھی گرا پڑا لفظ ہاتھ آجائے یا ذہن میں جو بھی تصویر ہے، اس سے ملتی جلتی جو بھی صورت الفاظ میں ڈھل جائے اسی سے کام چلا لیا جائے۔''

وہ ادب کی تخلیق کو قومی خدمت کی ادائیگی تصور کرتے ہیں لیکن یہ خدمت آدمی بغیر آزادی کے انجام نہیں دے سکتا۔

''تمام ادب خواہ وہ کسی سیاسی نظریے کسی مکتبِ فکر یا کسی شخص سے متعلق ہو بہرصورت قومی اثاثے کا جزو ہے۔ اسی لیے حالات کچھ بھی ہوں۔ ادب کی تخلیق بہرصورت ایک قومی

خدمت کی ادائیگی ہے، جس کا کچھ اعتراف اور کچھ قدر ہونی چاہیئے ۔شاید یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہر خادم قوم کی طرح ہر ادیب کو کم از کم اتنی آزادی ضرور میسر ہونی چاہیئے کہ وہ یہ خدمت انجام دے سکے۔''

والدہ سے نہ ملنے کی کیفیت کو ایک خط میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اماں کے بارے میں دل بہت پریشان ہے میں انہیں خط لکھ رہا ہوں لیکن اس سے کیا حاصل ہوگا جب تک میں خود وہاں نہیں ہوں مجھے ڈر ہے کہ غم و آلام کے ہجوم میں کہیں ان کی ہمت جواب نہ جائے ۔کتنی ظالمانہ بات ہے کہ تن تنہا ہمیں پالنے پوسنے اور کسی قابل بنانے کے لیے عمر بھر کی طویل اور کڑی جدوجہد کے بعد اب اس عمر میں انہیں پھر ویسی ہی تنگ دستی اور محرومی کا سامنا ہے جو اس جدوجہد کے آغاز میں تھا اور بہت سے جانکاہ صدمے اس کے علاوہ۔''

فیض کے بعض خطوط میں ہجر اور وصل کی کیفیت اور فلسفہ کو نبھانے اور مختصر لفظوں میں اس کا اظہار کرنے کی سعی کی ہے۔ایک مختصر خط کا اقتباس دیکھئے :

''بہت دل چاہا کہ تم بھی یہاں ہوتیں، لیکن شاید اچھا ہی ہوا کہ تم نہیں تھیں اس قسم کی ملاقات کا انجام ہمیشہ درد و حسرت کا خمیازہ ہوتا ہے۔''

فلسفیانہ انداز میں اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں :

''لذت پرستی کے فلسفے میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ اگر وقتی لذت کے بعد اس لذت سے زیادہ دُکھ اٹھانا پڑے تو اس لذت سے گریز کرنا چاہیئے اس سوال کا حل مشکل اس لیے ہے کہ اس لذت اور درد کا تناسب پہلے سے دریافت نہیں کیا جاسکتا۔''

''فیض کی ایک دلفریب خصوصیت ان کی معصومیت تھی انتہائی کرب میں بھی لبوں پر مسکراہٹ جیل کی بیڑیوں اور زنجیروں کی جھنکار میں چہرے پر اطمینان کے آثار دوستوں کی بے وفائیوں کے باوجود نعرۂ قلندری لگائے رکھنا اور ان صبر آزما صعوبتوں کو جھیلتے ہوئے بھی کسی طرح دل میں تکدر نہ لانا یہ صرف فیض جیسے عظیم انسان کا خاصہ ہے۔''

فیض کریکٹر بننا چاہتے تھے یا موسیقار لیکن ان کے اندر ایک کامیاب تخلیق کار چھپا ہوا تھا۔ان کی یہ تخلیقیت نثر میں بھی تازہ کاری کا احساس دلاتی ہے۔

فیض کے خطوط کی نثر میں دھیما پن، شیرینی، لطافت، پیکریت اور غنائیت پائی جاتی ہے۔ان کے خطوط کا انداز مفکرانہ، دانشورانہ اور ہمدردانہ ہے۔فیض بذات خود زندگی کی کڑی آزمائشوں سے گذرے تھے انہیں سماج کے دبے کچلے اور پس ماندہ عوام سے ہمدردی تھی وہ انسان سازی میں یقین رکھتے تھے۔فیض کے خطوط ان کے افکار وخیالات اور ان کی شخصیت کا کسی حد تک احاطہ کرتے ہیں۔

فیض کی یہ انگریزی خطوط بھی پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں جن کا اردو ترجمہ ''صلیبیں مرے دریچے میں'' کے نام سے شائع ہوا تھا اس کتاب میں 135 خطوط شامل ہیں۔ان کے علاوہ جیل سے لکھے ہوئے فیض کے غیر مطبوعہ 24 انگریزی خطوط دستیاب ہوئے ہیں جن کو فیض نے اس وقت لائقِ اعتنا نہیں سمجھا تھا اور ترجمہ کراتے وقت انہیں رد (REJECT) کر دیا تھا۔برسوں یہ تصور کیا جاتا رہا کہ یہ خطوط برباد ہو گئے یا دیمک چاٹ گئی۔

فیض کی بیٹی سلیمہ ہاشمی نے لکھا ہے کہ چند برس قبل میری نظر گھر میں پڑے ہوئے ایک پرانے پلاسٹک کے تھیلے پر پڑی۔اس تھیلے میں کچھ پرانے کاغذات خستہ حالت میں ملے جن میں دیمک لگی ہوئی تھی چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ یہ وہی خطوط ہیں جو فیض نے

مرزا ظفر الحسن کو ترجمہ کراتے وقت رد کر دیے تھے۔ سلیمہ ہاشمی نے ماہر آثاریات اسماء ابراہیم کی مدد سے انہیں کسی طرح محفوظ کیا۔ حال ہی میں یہ انگریزی خطوط کتابی صورت میں "TWO LOVE" کے نام پاکستان میں شائع ہو کر منظر عام پر آئے ہیں۔

اکتوبر ۲۰۱۱ء میں فیض کی دونوں بیٹیاں سلیمہ ہاشمی اور منیرہ ہاشمی ہندوستان تشریف لائیں تھیں۔ انہوں نے مہاتما گاندھی نیشنل ہندی یونیورسٹی گجرات کے الہ آباد سینٹر میں منعقدہ ۲۲۔۲۳/ اکتوبر کو ایک سمینار میں شرکت بھی کی تھی اس موقع پر سلیمہ ہاشمی نے فیض کے یہ خطوط اور دیگر تصویریں پر وجیکٹر پر بھی دکھائی تھیں انہوں نے وہ تصویریں بھی دکھائیں جن جیلوں میں فیض نے اسیری کے دن گذارے تھے اور جیل کے باغیچے میں چند پودے بھی لگائے تھے۔ لاہور جیل کے دروازے پر فیض احمد فیض کے نام کی تختی نصب کرادی گئی ہے۔ غالباً اس جیل کا نام بھی فیض کے نام پر رکھ دیا گیا ہے۔

سجاد ظہیر کی بیٹی نور ظہیر کے پاس ایلس فیض کے 188 انگریزی خطوط موجود ہیں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً فیض کو لکھے تھے۔ ان خطوط میں سے 33 خطوط کا اُردو ترجمہ نور ظہیر نے انگریزی سے اُردو میں کیا ہے۔ نور ظہیر نے فیض کی سوانح عمری، ہندی میں لکھی ہے یہ کتاب ''آج کے نام'' आज के नाम کے عنوان سے شائع ہو کر منظر عام پر آ رہی ہے اسی کتاب میں ایلس کے 33 انگریزی خطوط کا اُردو ترجمہ بھی شامل ہے۔

فیض نے مختلف اوقات میں مختلف دوستوں اور بیٹیوں کے نام بھی خطوط لکھے تھے۔ ان تمام خطوط کا ذکر اس مقالے میں ممکن نہیں ہے۔ البتہ سجاد ظہیر اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام لکھے گئے۔ خطوط قابلِ ذکر ہیں۔

البتہ یاسر عرفات نے ۱۹/فروری ۱۹۸۱ کو فیض احمد فیض کے نام بیروت سے ایک خط ان کی عمر کے ستر سال مکمل ہونے پر عربی زبان میں تحریر کیا تھا اس کا اُردو ترجمہ اس طرح ہے :

جو باتیں شاعری کے ذریعہ نہ کہہ سکے۔انہوں نے وہ باتیں اپنے خطوط میں بیان کردی ہیں۔

عام طور پر ترقی پسند شاعر کی نظمیں بلند آہنگ کا مطالبہ کرتی ہیں۔لیکن فیض کا آہنگ ایک خاص سطح سے بلند نہیں ہوتا۔یہی کیفیت ان کی نثر اور خطوط میں بھی پائی جاتی ہے ان کے خطوط میں مصروفیت شامل ہے۔فیض کسی مسئلہ پر اپنی رائے ضرور دیتے ہیں لیکن فوری طور پر کوئی فیصلہ صادر نہیں کرتے اور قاری کے ذہن میں ایک سوال چھوڑ دیتے ہیں۔

فیض کی شاعری کا عکس ان کے خطوط میں واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے جس طرح ان کی نظموں اور غزلوں میں طوالت نہیں ہے اسی طرح ان کے خطوط بھی مختصر ہیں۔ فیض کے خطوط تازہ تخلیقیت کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔فیض کے خطوط کے موضوعات میں تنوع ملتا ہے انہوں نے قومی اور بین الاقوامی مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

مشتاق یوسفی نے لکھا ہے کہ ''فیض اپنے عہد کی آواز نہیں بلکہ ان کا عہد ان کی آواز بن گیا۔''

بنیادی طور پر فیض پاک طینت، سادہ مزاج اور نرم دل واقع ہوئے تھے۔ان کے خطوط کی زبان بھی سادہ سلیس اور فطری ہے۔

> ''فیض نے اپنی عمر کی اتنی بلیغ اور اتنی جمیل ترجمانی کی ہے کہ اس کی ذات اس کی زندگی ہی میں ایک تحریک، ایک ادارے اور ایک روایت کا مرتبہ اختیار کرگئی۔فیض نے اپنا جتنا بھی سرمایہ نسلوں کے سپرد کیا ہے وہ اتنا گراں بہا ہے کہ آئندہ صدیوں تک فیض کے فن کی نو بہ نو توجیہات ہوتی رہیں گی۔'' (احمد ندیم قاسمی)

''فیض کی ہر تخلیق چاہے شعر ہو، یا نثر یا نجی مکتوبات کی شکل میں بلاشبہ ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے۔''

بہرحال فیض کے خطوط اپنے عہد کی تاریخ نہ سہی لیکن اُردو خطوط نگاری کی تاریخ کا ایک ناگزیر حصہ ضرور ہیں۔

کلام مبارک شاہ آبرو اور گوالیاری زبان وتہذیب: تجزیہ

وقار صدیقی کی تازہ تصنیف ''کلام مبارک شاہ آبرو اور گوالیاری زبان و تہذیب'' اردو کے تحقیقی سرمایہ میں اضافہ کی متحمل ہے۔انہیں علاقائی زبانوں اور مقامی بولیوں کی لسانی تحقیق سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ ملازمت کے سلسلے میں انہیں گوالیار کے نواحی علاقوں میں تدریسی خدمات انجام دینے کے مواقع بھی فراہم ہوتے رہے۔ ایک فن کار کی نظر سے موصوف نے گوالیری زبان کی مقامی لفظیات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور شاہ مبارک آبرو کے کلام کا گوالیری اور بندیلی زبانوں کے حوالے سے تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ تحقیق ان کے گہرے ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے۔

وقار صدیقی میں بے پناہ تخلیقی اور تحقیقی صلاحیتیں موجود ہیں۔ فرد خیال کے عنوان سے ان کا شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے لیکن ہائیکو سے انہیں گہری دلچسپی ہے اور ترجمہ سے بھی خاصا شغف ہے۔ وقار صدیقی نے آر۔ پی۔ شکلا کی کتاب ''موکھیا لوک کتھاؤں'' کا موکھیا لوک کہانیوں کے عنوان سے ہندی سے اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ ترجمہ زبان اور اسلوب کے اعتبار سے توجہ طلب ہے۔ وقار صدیقی کا علمی پس منظر شوکت تھانوی اور مولانا اشرف علی تھانوی سے تعبیر ہے۔ دانشوری اور درویشی انہیں ورثہ میں میسر آئیں۔ بنیادی طور پر وہ لسانی محقق ہیں۔ کی اہم تصنیف ''کلام مبارک شاہ آبرو اور گوالیاری زبان وتہذیب'' سے ان کے علمی شعور اور تحقیقی اور لسانی بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اہل ادب اور ارباب نظر نے اسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا اور ادبی حلقوں میں اس کتاب کی بڑی پذیرائی ہوئی اور ان کی علمی بصیرت کا اعتراف کیا گیا۔

آبرو کے محقق کی حیثیت سے وقار صدیقی کی شناخت قائم ہو چکی ہے۔ اگر چہ اُن کا تعلق مظفر نگر کی کھڑی بولی کے مخصوص خطے سے ہے لیکن انہوں نے گوالیر کو اپنا وطن ثانی تسلیم کر لیا، ایک سنجیدہ قلم کار کے طور پر اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دیں۔

وقار صدیقی ملازمت کے سلسلے میں گوالیر کے مختلف نواحی علاقوں میں قیام پذیر رہے۔ جہاں انہیں علاقائی بولیوں اور مختلف زبانوں کے علاوہ ان علاقوں کی تاریخ و تہذیب اور لسانی پس منظر کو سمجھنے کے مواقع فراہم کیے۔ گوالیری زبان کے حوالے سے آبرو کا تجزیہ بھی ان کے انہیں تجربات پر مبنی ہے۔

اردو زبان کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جن علاقوں سے گزری وہاں کی مقامی بولیوں اور لفظیات کو اپنے دامن میں سمیٹتی گئی یہی وجہ ہے کہ اردو میں دنیا کی جس قدر زبانوں کے الفاظ ہیں دنیا کی کسی زبان میں اتنی زبانوں کے الفاظ نہیں ملتے اور ہمیشہ اس کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اس طرح اردو کا ایک گلوبل کردار (Global Character) ابھر کر سامنے آتا ہے۔

اردو کے قادر الکلام شاعر شاہ مبارک آبرو گوالیر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدا ہی سے گوالیر کے اثرات اور لفظیات کو قبول کیا آبرو کی مادری زبان بھی گوالیری تھی۔ سنسکرت، ہندوی نژاد الفاظ اور بندیلوی کے استعمال سے بخوبی واقف تھے انہیں ہندو Myth یعنی دیومالائی سے بھی واقفیت تھی۔ حاتم، فائز، یک رنگ، آبرو کے معاصرین تھے انکے یہاں بھی گوالیری کے اثرات ملتے ہیں۔ یہ دور اردو کا عہد وسطیٰ تسلیم کیا جاتا ہے۔

آبرو بنیادی طور پر گوالیری زبان کے شاعر تھے۔ انہوں نے اردو اور خصوصاً ہندوستانی، بندیلی یا ہندوی لفظیات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ آبرو گوالیار (۱۶۸۳) میں پیدا ہوئے اور دہلی میں وفات پائی بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ پہلے انہوں نے فارسی میں شعر کہنا شروع کیے بعد ازاں ریختے میں اس وقت شعر کہے جب فارسی کا عروج

تھا اور شعرائے متاخرین میں فارسی کلام بہت مقبول تھا۔آبرو نے فارسی اور برج دونوں زبانوں کے الفاظ اور شعری رنگ وآہنگ کو قبول کیا۔

گوالیری کوئی باضابطہ زبان نہیں ہے یہ علاقائی دیسی بولی ہے ۔اور دیسی بولیوں میں قواعد کی پابندی نہیں ہوتی۔اس کا عمل انتشار سے اتحاد کی جانب ہوتا ہے جو زبان کے زمرے میں بھی شامل نہیں ہے ماہر لسانیات گریرسن نے بھی اسے بولی قرار دیا ہے جو Lingua Franca تسلیم کی جاتی ہے۔اس کا نہ کوئی رسم خط ہے اور نہ اس زبان میں کوئی باضابطہ کتاب موجود ہے۔گوالیری کا مرکزی علاقہ گوالیر تک محدود رہا اسے کبھی مرکزی حیثیت حاصل نہیں رہی البتہ گوالیری جستہ جستہ قدیم تصانیف میں مل جاتی ہے۔مثلاً سراج الدین علی خاں آرزو نے عبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغات کی تصحیح میں گوالیری زبان کا کئی بار ذکر کیا ہے اور اسے 'السنہ ہند' اور افصح زبان ہائے ہندی کہا ہے۔'' (کلام شاہ مبارک آبرو،ص:۶)

مولوی عبدالحق نے حافظ محمود شیرانی کو خالق باری کا ایک نسخہ (۱۷۷۳) دستیاب کرایا تھا اس کے دیباچہ میں یہ بھی درج ہے کہ اس کتاب کی زبان گوالیری ہے اور اس میں کتاب کا نام حفظ اللسان اور مصنف کا نام ضیاء الدین خسرو درج ہے۔

مرور ایام میں گوالیری زبان کا مرتبہ بلند تھا۔خان آرزو آخری بزرگ تھے جن کی تصنیف میں یہ لفظ ملتا ہے۔اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور عالمگیر کے عہد تک گوالیری شعر وادب اور موسیقی کی زبان تھی اور اٹھارویں صدی کے چند شعرا کے یہاں گوالیری زبان کے اثرات نظر آتے ہیں۔

گوالیار کی علمی اور تاریخی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن گوالیری موسیقی کی زبان ہے کیونکہ گوالیر موسیقی کا مرکز بھی رہا اور اسے سنگیت کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ دربار مغلیہ میں گوالیری کی شعری زبان اور اس کی موسیقی کو خوب مقبولیت حاصل ہوئی۔

آبرو مشہور صوفی بزرگ محمد غوث گوالیری کے نواسے تھے اور تان سین غوث گوالیری کے سنگیت میں شاگرد بھی تھے اور طریقت میں مرید بھی۔ اس لیے آبرو کو موسیقی سے والہانہ دلچسپی ہونا فطری تھا۔

خالق باری اور نسخہ اللہ خدائی میں جو ہندی الفاظ ہیں وہ سب گوالیری زبان کے ہیں اورنگ زیب کے عہد میں 'گلزارِ حال' کے ترجمہ نگار نے گوالیری زبان سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ محمد شاہ کے عہد میں اس کا استعمال متروک ہو گیا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل سلطنت کا زوال ہو گیا گوالیری کا اثر کمزور پڑنے لگا اس کی جگہ برج بھاشا نے لے لی۔ نسخہ اللہ خدائی منظوم نعت ہے جس میں گوالیری کے ہم معنی الفاظ نظم کیے گئے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ گوالیری کوئی باضابطہ زبان نہیں تھی یہ ہمیشہ دیسی اور علاقائی بولی کی شکل میں موسیقی کی مقبول زبان رہی اور علاقائی بولیوں کے اثرات سے اسے مقبولیت حاصل ہوتی رہی۔

وقار صدیقی نے اس کتاب میں کلام آبرو کے حوالے سے اردو زبان پر گوالیری اور مدھیہ پردیش کی بعض دوسری بولیوں بالخصوص بندیلی کے اثرات کی نشاندہی کی ہے اور وہاں کی تہذیبی قدروں کو بھی کلام آبرو میں اجاگر کیا ہے۔ (پیش لفظ' کلام آبرو ' مرزا خلیل بیگ)

وقار صدیقی نے پہلے آبرو کے کلام میں گوالیری زبان کے اثرات پر مضمون تحریر کیا تھا بعد ازاں آبرو کے کلام میں علاقائی لسانی اثرات کے موضوع پر بھی مقالہ قلم بند کیا۔ ان دونوں مضامین کی ادبی حلقوں میں بہت پذیرائی ہوئی۔

وقار صدیقی نے اپنی تصنیف میں کلام آبرو کی غزلوں سے ۲۷۴/اشعار کا انتخاب کر کے ان پر تحقیق اور تجزیہ کیا ہے جو اس علاقہ کے تاریخی، تہذیب اور لسانی پس منظر میں کیا گیا ہے۔ مثلاً 'ن' کا استعمال کثرت سے ملتا ہے اور تقریباً ہر شعر میں

اس کی مثالیں موجود ہیں۔

سیں ۸۳۸ بار، سوں ۱۷ بار، کوں ۶۷۹ بار اور نیں ۲۴۵ بار استعمال کیا گیا ہے۔

آبرو کو ایہام گوئی سے مختص کر دیا گیا ہے جو ان کی شاعری کا صرف ایک پہلو ہے۔

آبرو کے کلام میں لڑکوں سے اظہار عشق کی مثالیں اس زمانے کے مذاق کی نشاندہی کرتی ہیں۔

جو اہل دیدار اور صاحب ہنر ہے
اسے جلوہ جدھر دیکھے تدھر ہے

خوبصورت لڑکوں کے لیے سانولے لفظ کا استعمال علاقائی بولی کا اثر ہے آبرو جیسے عظیم کلاسیکل شاعر کا کلام اردو شاعری کا بنیاد گزار ضرور ہو سکتا ہے لیکن دور جدید میں قبول عام نہیں ہو سکتا۔

ہر طرف عشق کی لگی ہے ہاٹ
دل ہمارا ہوا ہے بارہ باٹ
زندگانی تو ہرطرح کاٹی
مر کے پھر جیونا قیامت ہے

دیوان آبرو کی ترتیب محمد حسن کا ایک اہم اور مستند کام ہے۔ محمد حسن کا خیال ہے کہ آبرو اگر شمالی ہند میں اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر نہ سہی لیکن ان کا دیوان شمالی ہند کا سب سے پہلا دستیاب شدہ اردو دیوان ضرور قرار پایا جو تاریخی اور ادبی اہم ہے۔

آبرو کے کلام میں بندیلی الفاظ کا استعمال بھی متعدد جگہوں پر کیا گیا ہے جس کی مثالیں ذیل کے ان اشعار سے دی جا سکتی ہیں۔

کم مت گنو یہ بخت سیاہوں کا رنگِ زرد
سونا وہی جو ہوے کسوٹی کسا ہوا

کسوٹی کسا ہوا، یعنی انداز بیان کا مخصوص رنگ محسوس کیا جا سکتا ہے جو بندیلی کی جانب متوجہ کرتا ہے۔

میلے سیں آبرو کے ہر دم کے ساتھ آنجھو
نکلا ہے یوں کوئے سیں جونکر پھر بروہا

اس شعر میں کوئے کا لفظ کنویں کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہاں ایک مقامی لفظ بروہا استعمال کیا گیا ہے۔ بروہا ایک ایسا گھڑا ہوتا ہے جس میں چھید کر کے پانی بھر دیا جاتا ہے اور پھر اس کے ذریعہ پان کی کھیتی کی جاتی ہے۔ پان کے پودوں کی قطاروں کو بھی بروہے کہا جاتا ہے اور پان کا کاروبار کرنے والے لوگ برئی کہلاتے ہیں۔ گوالیر کے نزدیک بلوانا نام کی ایک جگہ ہے جو Capital of betal کے لیے ملک بھر میں مشہور بھی ہے۔

برہ کی راہ میں جو بھی گرا سو پھر نہ اٹھا
قدم پھرا نہیں یاں آکے دشیکروں کا
ہے ہمن کا پیام کوئی لے جا
کہ مجھے آکے ٹک درس دے جا

ہمن کا استعمال ہمارے کے لیے ہوا ہے۔ ہمن تمن الفاظ ہمارے اور تمہارے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

بوالہوس کوں ہوا ہے تب سے مغز
جب سے تم نے اسے بلا بھیجا

سے اور کو میں ں کا اضافہ علاقائی اثر ہے۔

خوبوں میں سب جگت کے تو زور ہے ممولا
سارے جہاں میں تیرا اب شور ہے ممولا
(ممولا غزل کی ردیف کا حصہ ہے)

ہم سیں چرائی اورسیں انکھیاں ملا گیا
ظالم کسی کو مار کسی کوجلا گیا
کیونکہ مجھے جنون نہ ہو اس چھلاؤں سے
ٹک دے جھمک پری کی طرح پھر بلا گیا

بندیلی میں چھلاؤں دھوکہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

پیارے ترے نین کو آہو کئے جوکوئی
وہ آدمی نہیں ہے حیوان ہے بچارا
کرنے سے سیر ہرگز مژگاں نہ ہو ہماری
جوں جوں پڑے ہے پانی تیوں تیوں چلے جواسا
جوسپاہی مورچے کی آڑ سیں کرتا ہے چوٹ
یوں تمہارے وار کرتے ہیں نیں مژگاں کی اوٹ
روبرو اور آنکھ اوجھل ایک سا جس کا پیار
اس طرح کا کم نظر آتا ہے کوئی یاراں کا بیچ

آنکھ اوجھل یہاں روبرو کے مقابل رکھ کر شعر میں لطف پیدا کیا ہے۔آبرو کے دیوان میں امرد پرستی سے متعلق اشعار بھی موجود ہیں۔

زبس ہم کونہایت شوق ہے امرد پرستی کا
جہاں جاویں وہاں دوچار کوہم تاک رکھتے ہیں
جب کہ ایسا ہوں گندمی لونڈا
تب گنہگار کیوں نہ ہوں آدم
مگر یہی کہ کبھی تم جو انمنے ہوتے
تو اس طرح کوں تمہاری نہ دیکھ سکے ہم

بندیلی میں اداس کے لیے انمنے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

دل تری زلف دیکھ کیوں نہ ڈرے
جال ہو ہے شکار کا دشمن
آبرو کو کھوکے پچھتاؤں گے تم
ہم کو لازم ہے اتا کہنا سجن
کیا شیخ کیا برہمن جب عاشقی میں آوے
بسی کرے فرامش زنار پھول جاوے

آبرو کا یہ شعر متصوفانہ مزاج کا حامل ہے۔

جلوہ گر مجھ دل منیں ہر وقت وہ دلدار ہے
آئینے میں جب کبھی دیکھو تو بت دیدار ہے
ذبح کرنے کوں ناحق بے کسوں کے
بتا تیری کمر پہ کن کسائی
تم اپنی بات کے راجا ہو پیارے
کہیں سیں ضد تمہیں ہوہے سوائی
پسیدی قند کی پھیکی لگی جب
تمہارے رنگ کی دیکھی گرائی

آبرو ہندوستانی علاقائی بولیوں کی تکثیریت کا شاعر ہے جس کے یہاں گوالیری اور بندیلی لفظوں کا سیل بے پناہ امنڈتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ الفاظ از خود تہذیب وثقافت اور تاریخ وتمدن کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جو مصنف کے ذاتی تجربات اور علاقائی بولیوں کے افراد کے درمیان رہ کر قلم بند کی گئی۔

وقار صدیقی کی کتاب ''کلام مبارک شاہ آبرو اور گوالیاری (گوالیری) زبان و تہذیب'' کے موضوع پر نہایت معتبر اور مستند ہے جو مقامی لفظیات کے حوالے سے

ایک تجزیاتی نوعیت کی تحقیق ہے۔موصوف کی اس کتاب کو محققین کے درمیان بہت پذیرائی ہوئی اور اسے Reference book کے طور پر تسلیم کیا گیا۔

آبرو نے اپنے کلام میں علاقائی لفظیات کا استعمال کیا ہے جو مقامی بولیوں کے لسانی تحفظ کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

مبارک نام تیرے آبرو کا کیوں نہ ہو جگ میں
اثر ہے یو ترے دیدار کی فرخندہ حالی کا

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی تصانیف وتالیف

۱۔ اُردو ادب کی تاریخ

۲۔ تحریکِ آزادی اور اردو نثر

۳۔ اسالیب فکر

۴۔ معروضات

۵۔ شہیدان جنگ آزادی

۶۔ جوشؔ کی تیرہ نظمیں

۷۔ تحریک آزادی اور اردو صحافت

۸۔ اقبال سہیلؔ کا فن

۹۔ فاصلاتی نظام تعلیم

۱۰۔ آسان اردو گرامر

۱۱۔ جدید اردو ریڈر

۱۲۔ اردو ہندسی ڈکشنری

۱۳۔ بنگالی کہانیاں (ترجمہ)

۱۴۔ دون کا سبزہ (رسکن بونڈ کی انگریزی کہانیوں کا اردو ترجمہ)

۱۵۔ ہیونگ سانگ کا سفر ہندوستان (ترجمہ)

۱۶۔ جنم دن (ترجمہ)

۱۷۔ شہباز امروہوی: فن اور شخصیت

۱۸۔ Freedom Movement and Urdu Prose

مصنف کی زیر طبع کتابیں

۱۔ دہلی کے اردو ادارے

۲۔ انشائیہ کا فن

۳۔ غالبؔ کی منتخب غزلوں کی شرح

۴۔ تنقیدی رویّے